ماہنامہ

طلوعِ اسلام

مارچ 2023ء

لاہور

اشاعت کا اِسی واں سال

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (الحدیث)

حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

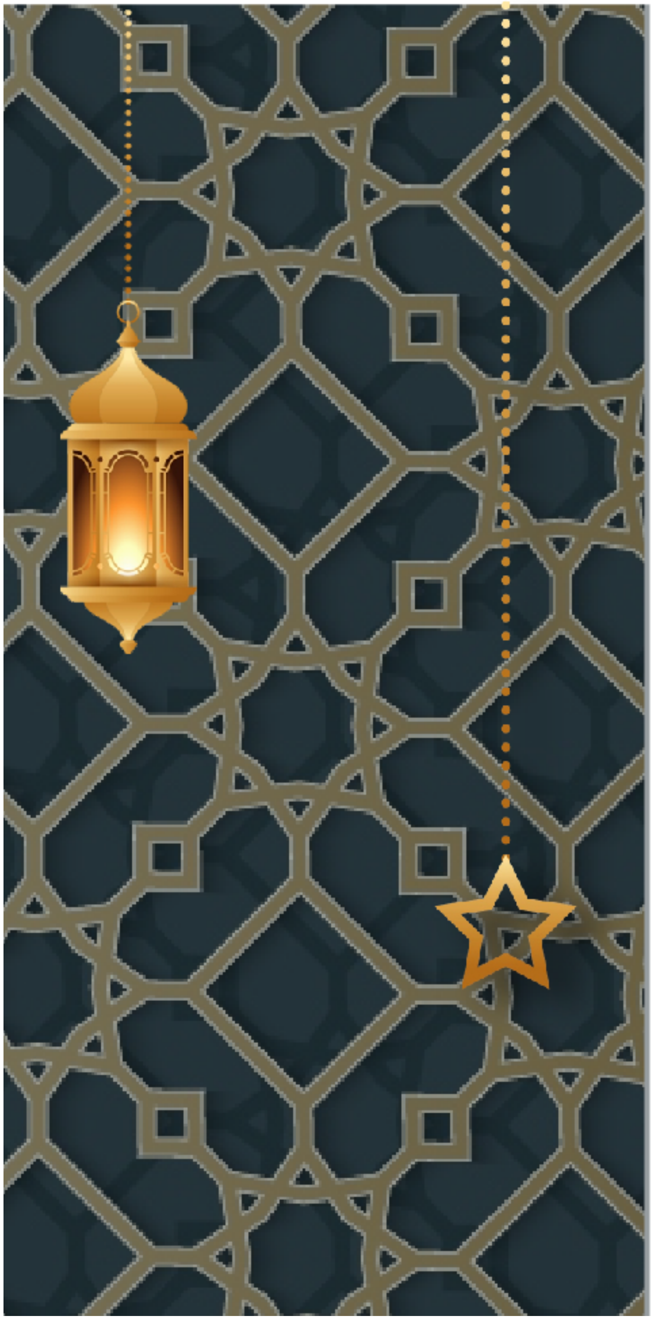

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ (2:185)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِس اجتماعی اور عسکری ٹریننگ (اور تربیتِ نفس) کے لئے رمضان کے مہینے کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ اس لئے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتداء ہوئی تھی ـــــ وہ قرآن جو تمام نوعِ انسانی کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ایسی راہ بتاتا ہے جو واضح اور اُبھری ہوئی ہے، اور جو مستقل اَقدار کے پیمانے پیش کرتا ہے تاکہ حق اور باطل میں تمیز ہوتی رہے۔ روزوں کا نظم وضبط اِس عظیم پروگرام کے لئے مستعد رہنے کی سالانہ ٹریننگ ہے۔ سو جو شخص اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اُسے چاہئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ لیکن جو مریض ہو، یا حالتِ سفر میں تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ (اور جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتا ہو اس کے متعلق پہلے کہا جا چکا ہے۔ یہ رعایتیں اس لئے ہیں کہ) خدا تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے، سختی اور تنگی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے تم دوسرے دِنوں میں گنتی پوری کر لیا کرو۔ (مفہوم القرآن از پرویز)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذہب اور دینِ اسلام کا تقابلی جائزہ

یورپ نے غالباً مانی کے عقیدے سے روح کو مادہ کی ثنویت کا خیال اخذ کیا اور بلا تنقید اسے قبول کر لیا۔ اسی نظریہ کی بنیاد پر انہوں نے مذہب (Religion) اور سیاست (State) کی ثنویت کا تصور پیش کیا۔ قرآنِ کریم میں مذہب کا لفظ ہی کہیں نہیں آیا۔ اس لئے اسلام کو مذہب نہیں بلکہ قرآن کے دیئے ہوئے دین کے نام سے پکارنا چاہیئے۔ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ (3:19)۔

دینِ اسلام	مذہب
دین اجتماعی نظامِ زندگی اور خارجی حقیقت ہے۔	1- مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق اور داخلی تجربہ کا نام ہے۔
دین میں معاشرہ کا انداز اور آئین بتا سکتے ہیں کہ وہ قوانینِ خداوندی کے مطابق متشکل ہوا ہے یا نہیں۔	2- مذہب میں ہر فرد اپنے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا خدا کے ساتھ رشتہ قائم ہو گیا ہے۔
دین کا مقصود عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔	3- مذہب میں ہر فرد کا منتہیٰ اپنی اپنی نجات ہوتا ہے۔
دین میں اجتماعی زندگی کے نتائج ساتھ کے ساتھ بتاتے چلے جاتے ہیں کہ ملت صحیح راستے پر چل رہی ہے یا نہیں۔	4- مذہب میں کوئی خارجی معیار ایسا نہیں ہوتا جس سے پرکھا جا سکے کہ انسان کے اعمال صحیح نتائج پیدا کر رہے ہیں یا نہیں۔
دین میں تفرقہ کو شرک کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پوری نوعِ انسانی سے مخاطب اور اس کا رب، رب العالمین اور رسول رحمۃ للعالمین کا مقام رکھتے ہیں۔	5- مذہب انسان کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور اس میں ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔
دین، انہیں حقائق کے پیچھے چلاتا ہے اور ان کے سطحی جذبات کی تسکین کی بجائے ان پر قابو پانے کی تعلیم یوں دیتا ہے۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز	6- مذہب عوام کے جذبات کے پیچھے چلتا ہے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کئے چلا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تعلیم یہ ہے۔ زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز
دین خوف کو شرک قرار دیتا ہے اور انسان کے دل کو جرأت اور بے باکی کا مسکن بناتا ہے۔	7- مذہب انسان کے دل میں ہر وقت خوف پیدا کرتا رہتا ہے اور اپنی ہر بات ڈر سے منواتا ہے۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور
مارچ 2023ء

جلد 76 | شمارہ نمبر 03

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر اعجاز رسول
اقبال ادریس ایڈووکیٹ

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50روپے فی پرچہ
پاکستان: 600روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 1000روپے سالانہ

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: سپاسنامہ بخدمت قائداعظم محمد علی جناحؒ	ادارہ	4
ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	پرویزؒ	8
روزے تم پر فرض کئے گئے ہیں	مفہوم القرآن	14
درسِ قرآن (سورۃ النساء، آیت نمبر 34)	پرویز علیہ الرحمہ	17
انقلاب لانے کا طریقۂ کار	پرویز علیہ الرحمہ	40
قرآن پر اعتراضات کے جوابات	خواجہ ازہر عباس، کراچی	54

ENGLISH SECTION

The Human Self and Allah By G. A. Parwez (Translated by: Dr. Ejaz Rasool) Episode No. 14	61

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: +92 310-4800818
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions	For International Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672	IBAN:PK36NBPA0465004073177672 Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور   اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو، بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے
غبارِ رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے
ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے
حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے
زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے
جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

سپاسنامہ
بخدمت قائداعظم محمد علی جناحؒ

(23مارچ1940ء)

مارچ 1940ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس میں طلوعِ اسلام نے بھرپور شرکت کی۔ اپریل 1940ء کے شمارہ میں اس اجلاس کی روئیداد میں طلوعِ اسلام کے اُس سٹال کا ذکر بھی ملتا ہے جو اجلاس کے دوران لیگ کے پنڈال کے باہر نصب کیا گیا تھا۔ سٹال کی تفاصیل بیان کرتے ہوئے مدیر طلوعِ اسلام لکھتے ہیں کہ ”سٹال سے ہمارا مقصد پمفلٹوں کی اشاعت سے کہیں زیادہ کرم فرمایانِ طلوعِ اسلام سے ذاتی طور پر متعارف ہونا تھا اور شکرِ ایزدی کہ اس باب میں ہم فائز المرام واپس لوٹے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ ہندوستان سے دُور دراز اور غیر معروف گوشوں کے لوگ آئے اور کوئی ایسا نہ تھا جو طلوعِ اسلام سے پہلے ہی واقف نہ ہو۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا صدقہ ہے کہ جو اس مردِ مومنؒ کی دعاؤں کے طفیل ہمارے حال پر ارزاں ہوا جس کی یاد طلوعِ اسلام کا سرمایۂ زندگی ہے۔ ہمارے لئے یہ امر باعث صد مسرت تھا کہ جو حضرات وہاں تشریف لائے۔ ان کا ادارہ سے محض ایک رسالہ کے خریدار کا سا تعلق ہی نہ تھا بلکہ وہ اپنے آپ کو ادارہ کا ایک جز سمجھتے تھے۔ ادارہ کے ساتھ ان کا رشتہ علمی کی بجائے یکسر قلبی تھا۔ سٹال پر ویسے بھی ہماری توقعات سے بڑھ چڑھ کر رونق رہی اور اس ہجوم میں ہمارے بعض احباب اگر ہمارا ہاتھ نہ بٹاتے تو ہمیں بڑی مشکل کا سامنا ہوتا۔ بعض کتابیں سٹال پر اتنی جلد ختم ہو گئیں کہ ایک کثیر تعداد حضرات کو مایوس لوٹنا پڑا۔“

یاد رہے کہ ادارہ طلوعِ اسلام کا دفتر اُن دنوں دہلی میں تھا اور غلام احمد پرویزؒ بھی دہلی ہی میں مقیم تھے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے مذکورہ بالا اجلاس میں شرکت کے لئے نہ صرف یہ کہ ادارہ طلوعِ اسلام کا وفد دہلی سے لاہور آیا بلکہ اپنی والہانہ محبت اور عقیدت کے پیش نظر ادارہ نے اس تقریب میں قائداعظم محمد علی جناحؒ کی خدمت میں ایک سپاسنامہ بھی پیش کیا جو تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ ذیل میں تجدیدِ یاداشت کے لئے اُسے آج پھر سامنے لایا جا رہا ہے۔ (مدیر)

بہ شرفِ نظر

شیرِ بیشۂ بیبا کی وحریت۔ ضیغمِ نیستانِ جرأت وبسالت۔ شاہینِ افلاکِ تدبر وسیاست۔ پروانۂ شمعِ اخوّت وحمیت۔ طرۂ کلاہِ مُلک وملت۔ بطلِ جلیلِ ہندیاں۔ وقائدِ اعظمِ اسلامیان۔ محترم المقام جناب محمد علی جناح (مدظلہٗ العالی)

حریت نواز!

ذرا تصور میں لائیے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیابان میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک بکھرا ہوا قافلہ نشانِ منزل سے مایوس ہو کر ضعفِ عزیمت سے پا شکستہ بیٹھ چکا ہو۔ ایک درماندہ راہرو کی صدائے دردناک جو آوازِ رحیل کا کام دے رہی تھی، فطرت کے اٹل قوانین کے تحت خاموش ہو چکی ہو۔ شام کا بھیانک سناٹا۔ سر پر منڈلانے والی شبِ تیرہ وتار کی ہیبت انگیزیوں کا پیامِ جانکاہ دے رہا ہو۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ موت کو قریب تر لاتی نظر آ رہی ہو۔ درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہزنوں کی ریشہ دوانیاں دامنِ صحرا پر پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آ رہی ہوں۔ وہ لوگ جن کی قیادت وسیادت پر بھروسہ تھا، برادرانِ یوسف کی طرح اپنے قافلہ کی گراں بہا متاع دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہوں۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو۔ افرادِ قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اس الم انگیز کیفیت کا احساس ہو ان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اُٹھ رہی ہوں کہ دُور اُفقِ اُمید سے ایک شاہسوار رواں دواں اُمیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان سوختہ سامانوں کی طرف بڑھتا چلا آئے۔ منتشر افرادِ کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت و بربادی کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا انہیں کسی محفوظ مقام کی طرف لے جانے کی فکر کرے۔ اندازہ فرمائیے کہ جو قلبی کیفیت اس وقت اُن راہ گم کردہ مسافروں کی ہوگی، وہی حالت آج ملتِ اسلامیہ (ہندیہ) کی ہے۔ تحریک آزادی کے آغاز سے مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور انہیں اِدھر سے اُدھر اُڑا لے جاتا۔ پانی کی رو آتی اور اُنہیں اپنے ساتھ بہا لے جاتی۔ اس کاروانِ بے سالار کی متاعِ گراں بہا کو لوٹنے کے لئے چاروں طرف سے قوتیں ہجوم کر کے آ رہی تھیں۔ غیر تو غیر، خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ ان کی سحر طرازیاں اور فسوں سازیاں ملتِ بیضا کو خدائے طورِ سینا سے ہٹا کر گوسالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں غرضیکہ حالت یہ تھی کہ۔

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو　　ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لئے

قوم کی صحیح راہنمائی کرنے والے ایک ایک کر کے چل بسے تھے۔ بزمِ ملت کی آخری شمع جس کی ضیاء پاشیوں سے لاکھوں آنکھیں پُرنور تھیں۔ 21 اپریل 1938ء کی صبح کو بجھ چکی تھی۔ اس کس مپرسی اور بیکسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے اِس منتشر قافلہ کی شیرازہ بندی کے لئے آپ کی ذاتِ گرامی کو چُن لیا اور آپ کی نگاہِ دُوررس نے اس قافلے کو بتایا کہ ان کے گردوپیش کس کس قسم کی خطرناک گھاٹیاں موجود ہیں۔ وہ گھاٹیاں جن میں کہیں ''متحدہ قومیت'' کے دامِ ہمرنگِ زمین میں کبوترِ حرم کو پھانسنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ کہیں کسی منبر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ قومیتیں مذہب سے نہیں، اوطان سے بنتی ہیں اور یوں اس طائرِ لاہوتی کے بال و پر کو غبار آلودۂ ارض و بوم بنا کر اُمتِ رسول ﷺ کا فتنۃ للنّاس کو جغرافیائی حدود کی آب وگل میں محبوس کیا جا رہا تھا۔ کہیں ''وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ'' (42:38) کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط انتخابات کے سراب کو آبِ حیواں بنا کر دکھایا جا رہا تھا۔ کہیں اس ''اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ'' (4:59) مامور جماعت کے لئے غیر مسلموں کی امامت وقیادت کو عین دین قرار دیا جا رہا تھا۔ کہیں انگریز کے خلاف ''متحدہ محاذ'' کے طلسم سے کفار ومشرکین سے تولّی کے جواز کے فتاویٰ شائع ہو رہے تھے۔

ایک طرف ایک مغنی آتش نفس سرودگاہِ واردھا کی مستعار لے میں یہ خواب آور گیت گا رہا تھا کہ عالم گیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں اس لئے اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ دوسری طرف کچھ خداوندِ مکتب شاہین بچوں کے لئے، اہمسا کی بازوشکن تعلیم کی اسکیمیں تیار کر رہے تھے۔ ہندو اپنے ذہن میں ''رام راج'' کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا اور اس کے لئے انگریز سے ''شریفانہ معاہدے' Gentleman Agreement' استوار کر رہا تھا۔ ہندوؤں کے شور و غوغا سے متاثر انگریز بھی مسلمانوں کو بلا تامل ہندو کے ہاتھ میں دے دینے پر آمادہ تھا کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ غلامی کا جذبۂ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے۔ جو لوگ اغیار کی صفوں میں کھڑے ہو کر ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کے دعویٰ کر رہے تھے ان میں اتنا سمجھنے کی بھی استطاعت نہ تھی کہ بساطِ سیاست پر یہ آئینی مہرے کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔ ہندو خوش تھا کہ میں نے 9 کروڑ فرزندانِ توحید کو اچھوتوں کی صف میں ملا دیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ خنجر ہلال، جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیجہ صلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی، اسے گنگا کی لہروں میں بہا دیا گیا کہ اس کس مپرسی کے عالم اور اس خلفشار و تشتت کے وقت آپ آگے بڑھے اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ہر خفیہ منصوبے اور ہر پوشیدہ سازش کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر دیا اور یوں ان کے تصورات کی حسین دنیا کو ایک خوابِ پریشان میں تبدیل کر کے رکھ دیا اور ساری دنیا پر اس حقیقت عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ ؎

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

بطلِ جلیل القدر!

ہمیں خوب احساس ہے کہ آپ کی منزل کس قدر کٹھن اور راستہ میں کس قدر مشکلات کا سامنا ہے۔ جہاں تک غیروں کا تعلق ہے مسلمان جیسی منتشر قوم کے مقابلہ میں ہندوستان اور برطانیہ کی دو بڑی قوتوں کا متحدہ محاذ ہی کچھ کم سنگِ گراں نہیں لیکن غیروں سے کہیں زیادہ مہیب اور جان گداز مشکلات خود اپنوں کی پیدا کردہ ہیں۔ ان ''اپنوں'' کو بھی چھوڑیئے جو محض اپنی سنہری اور روپہلی مصلحت کوشیوں کی خاطر نشر گاہِ واردھا (Radio Station) کے آلاتِ مکبر الصوت (Loud Speakers) بنے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس مخالفت پر مجبور ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ماتم تو ان ''مخلص منافقین'' کا ہے جن کی رفاقت و حمایت بیش از یں نیست کہ ؎

کافر نتوانی شد، ناچار مسلمان شو

جن کا مقصدِ وحید اپنے طرۂ وجاہت کا قیام و بقا ہے۔ خواہ یہ آستانۂ خواجہ یثرب سے وابستگی ظاہر کرنے سے حاصل ہو جائے یا لشکرِ بولہبی میں شمولیت سے۔ بایں ہمہ نہ ان غیروں کا ہجومِ مخالفت ایسا ہے کہ اس سے کچھ خوف کھایا جائے اور نہ اپنوں میں سے بعض کی نوازشہائے بیجا اور دوسروں کے طعنہ ہائے دلخراش ایسے کہ ان کا غم کھایا جائے۔ کہ جو حق پر ہو اسے کسی کی مخالفت کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔

مگر کیا غم کہ تیری آستیں میں ہے یدِ بیضا
رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں اب تک

حریت مآب!

ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ مسلمانوں کی موجود، تگ و دوِ حیات میں جو نصب العین آپ کے سامنے ہے وہ وہی ہے جو ہر مسلمان کی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہئے۔ جس کے دل میں بہ حیثیت مسلمان زندہ رہنے کی تڑپ اور اپنی نسلوں کو بہ حیثیت مسلمان رکھنے کی آرزو موجزن ہے اور کسے معلوم نہیں کہ وہ نصب العین ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (Muslim India) کی تشکیل کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس طرح آپ احوال وظروف کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے قدم بقدم اس درخشندہ نصب العین کی طرف بڑھتے جارہے ہیں وہ آپ کی بلند نگہی اور حسنِ تدبر کا آئینہ دار ہے۔ سطح بیں لوگوں نے آپ کو صرف ایک فاضل مقنن اور دیدہ ور مدبر کی حیثیت سے ہی پہچانا لیکن جن لوگوں کو آپ کے قریب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مبداءِ فیض نے آپ کو اس قدر ذہن رسا کے ساتھ ساتھ کس قدر دلِ پُرسوز و پُردرد کی نعمتوں سے نوازا ہے۔

خرد نے تجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ　　سکھائی عشق نے تجھ کو حدیثِ رندانہ

اور قلب ونظر اور عقل وعشق کا یہی امتزاج ہے جو ایک ناخدائے کشتی ملت کی متاعِ گراں بہا ہے۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُر سوز　　یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

عالی مرتبت!

آپ یقین فرمایئے کہ جس قوم کی فلاح و بہبود آپ کی زندگی کا منتہیٰ ہے۔ اُس قوم کا سوادِ اعظم آپ کی قیادت وامارت پر کامل بھروسہ رکھتا ہے اور اُن کی خاطر آپ نے جو گرامی قدر قربانیاں کی ہیں، اُن کے دل میں ان کا پورا پورا احساس ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ سرزمینِ پنجاب جو ملتِ اسلامیہ کے اس اجتماعِ عظیم کی تقریب پر آپ کی تشریف آوری سے سرفراز ہونے والی ہے اس میں آئینی نقطۂ نگاہ سے Constitutionally ابھی پراونشل لیگ کا قیام بھی عمل میں نہیں آسکا، لیکن ہمیں اُمید ہے کہ یہ حقیقت آپ کی نگاہ سے مستور نہ ہوگی کہ پنجاب کا ایک ایک قریہ اور اس قریہ کے ایک ایک فرد کا دل آپ کی عظمت و عقیدت کا نشیمن بنا ہوا ہے۔ بس کسی ایک مردِ خود آگاہ وخدا دوست کے نعرۂ مستانہ کی دیر ہے، یہ طوفانِ بلا انگیز کسی سے روکے نہیں رکے گا۔ اس وقت بچے گا وہی جو کشتی ملت میں اخلاص و دیانت سے سوار ہوگا۔ اور پکارنے والا پکارے گا کہ:

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ (11:43)

سید القوم! ادارۂ طلوعِ اسلام، جسے ہزارہا پُرخلوص اور صحیح النظر مسلمانوں کی ترجمانی کا فخر حاصل ہے، اجلاسِ لیگ کی صدارت پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک وتہنیت پیش کرتا ہے اور مستدعی ہے کہ جس نصب العین کی طرف آپ کا قدم اُٹھ رہا ہے، قوم کو اس کی طرف اور تیز گامی سے بڑھاتے جایئے۔ اس نصب العین کے اصول کے لئے اگر ضرورت پیش آئی تو آپ دیکھیں گے کہ قوم کس طرح کفن بردوش وسربکف آپ کی دعوت پر لبیک کہتی ہے۔

بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن　　چوں پختہ شوی خودرا بر سلطنتِ جم زن

ارا کینِ ادارہ طلوع اسلام، دہلی

پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟

سلیم! میرے مضامین پڑھ کر جو خیالات تمہارے دل میں پیدا ہوئے وہ بالکل فطری ہیں اور ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو قرآن کریم کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرتا ہے اور جس کی نگاہ ان حقائق کی متلاشی ہوتی ہے جنہیں خدا نے اس کتاب مبین میں بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے اور جو قوموں کی تباہی و بربادی اور فوز وفلاح کے لئے غیر متبدل اور اٹل قوانین ہیں۔ تم میرے مسلک سے واقف ہو۔ میں قرآن کو مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ تمام نوع انساں کی انفرادی اور اجتماعی مشکلات کا واحد حل اور زندگی کے مصائب و آلام کا حتمی علاج سمجھتا ہوں اور میرا یہ عقیدہ محض خوش فہمی پر مبنی نہیں بلکہ میں علیٰ وجہ البصیرت اس کا یقین رکھتا ہوں' ایسا یقین جو وجہ طمانیت قلب اور باعث تسکین روح ہوا کرتا ہے' نہ کہ توہم پرستی کا پیدا کردہ فریب نفس جسے یقین اور اطمینان کا نام دے دیا جاتا ہے۔

تم پوچھتے ہو' اور ایسا پوچھنے میں تم بالکل حق بجانب ہو' کہ جب مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت آج نمازیں بھی پڑھتی ہے' روزے بھی رکھتی ہے' زکوٰۃ بھی دیتی ہے' حج کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے' تو ان اعمال کا وہ نتیجہ مرتب کیوں نہیں ہوتا جو عہد محمد ﷺ رسول اللہ والذین معہٗ (حضور نبیٔ اکرم ﷺ اور صحابہؓ کے عہد) میں ہوتا تھا۔ چونکہ تم فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ اصطلاحات میں الجھنے کے عادی نہیں' اور نہ ہی یہ طریق ان حقائق کو سمجھنے کے لئے چنداں مفید ہوتا ہے' اس لئے تمہیں کھلے کھلے الفاظ میں بتانا چاہتا ہوں کہ آج ہمارے یہ ''اعمالِ حسنہ'' کیوں بے نتیجہ رہتے ہیں۔

سلیم! ذرا غور کرو کہ جاڑے کا موسم ہے۔ سخت سردی کا دن۔ شام کے قریب' جبکہ آفتاب کی شعاعوں میں تمازت باقی نہیں رہی' رحمتؔ کی بیوی اپنے خورد سال بچوں کو لے کر اپنی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بیٹھی ہے۔ رحمتؔ کی بیوی کو تم جانتے ہو؟ تم بچپن میں ان کے ہاں کھیلنے جایا کرتے تھے۔ عمر کا تقاضا تھا کہ اس کے چہرے پر شگفتگی و شادابی ہوتی۔ لیکن مسلسل فاقوں نے اسے ایسی افسردگی اور پژمردگی میں بدل دیا تھا کہ وہ ایک اجڑا ہوا بہشت معلوم ہوتا تھا جس پر سوائے نورِ عصمت کے (جو ہر ایسی پاک دامن بی بی کے چہرے پر ہونا چاہئے) رونق اور زندگی' تازگی اور بشاشت کا کوئی نشان تک باقی نہ تھا۔ ہاں! وہ اپنے بچوں کو لے کر چولہے کے قریب آ بیٹھی۔ خشک ٹہنیاں' سوکھے ہوئے پتے' خس و خاشاک' دوپہر کو اکٹھا کر لائی تھی۔

انہیں سلگا دیا تا کہ بچے آگ تاپتے رہیں۔ لیکن بچوں کو تو سردی سے زیادہ بھوک ستا رہی تھی۔ اس نے ان کے پیہم معصوم تقاضوں سے مجبور ہو کر ہنڈیا میں خالی پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا اور یوں' ان ننھے بچوں کو نہیں! خود اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ ہر آہٹ پر کان اور ہر جنبش پر نگاہ تھی۔ بچے اور ان کی ماں رہ رہ کر گلی کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ سورج ڈوب گیا تو گلی کے دوسرے کنارے سے رحمت آتا دکھائی دیا۔ ننگے پاؤں' پنڈلیاں گرد و غبار سے اٹی ہوئی' گھٹنوں تک پرانا تہمد' پھٹا ہوا گاڑھے کا کرتا جس کی آستینیں بوسیدہ ہونے کی وجہ سے کہنیوں تک چڑھا رکھی تھیں۔ بس' اس شدت کے جاڑے میں یہی کل کائنات' چہرے پر زردی چھائی ہوئی' ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئیں' گھر کی طرف قدم اٹھاتا' لیکن قدم بمشکل اٹھتا۔ دروازے کے قریب آیا تو بیوی نے خاموشی سے بسم اللہ کہہ کر استقبال کیا۔ دونوں بچے ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ بیوی نے ایک حسرت بھری نگاہ میاں کے افسردہ چہرے پر ڈالی۔ اس کی غم آلود آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ مجھے تو آج بھی کہیں مزدوری نہیں ملی۔ دن بھر ادھر ادھر پھرتا' لوگوں کی منتیں خوشامدیں کرتا رہا لیکن کوئی کام نہ مل سکا۔

عین اس وقت سامنے کی مسجد میں خواجہ صاحب کی طرف سے دو ہزار روپے کا گراں بہا قالین بچھایا جا رہا تھا اور نمازی اسلام کی شوکت وعظمت پر ایک دوسرے کو مبارک باد اور خواجہ صاحب کو جنت کی بشارتیں دے رہے تھے۔

☆☆☆

سلیم! تم عنایت اللہ کو جانتے ہو نا! وہ تمہارے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ کس قدر ذہین اور کیسا شریف بچہ تھا؟ لیکن بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کی ماں دن بھر محنت مزدوری کرتی اور بچہ کی پرورش کا سامان مہیا کرتی۔ لیکن جب مزدوری مردوں کو نہ مل سکے تو عورتوں کو مزدوری کہاں سے ملے؟ میں نے اپنی کھڑکی سے دیکھا کہ صبح مدرسے جاتے وقت ماں نے بچہ کو چھاتی سے لگایا۔ آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ لیکن دل کو کڑا کر کے بیٹے کو تسلی دی کہ مدرسے سے ہو آؤ۔ بس تمہارے آنے پر روٹی تیار ملے گی۔ میں ابھی پکاتی ہوں۔ جاؤ میرا بیٹا! خدا حافظ!

سلیم! اگر ہمت ہو تو اس ماں کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھو کہ بیٹے کو یوں بھوکا مدرسے بھیجتے وقت اس کے سینے میں کس قیامت کے جذبات غم وحزن کا طوفان برپا ہوگا۔ وہ غربت وفلاکت کا مجسمہ چپکے سے مدرسے چلا گیا۔ شام کو آیا۔ ماں گھر پر نہ تھی۔ شاید دانستہ باہر چلی گئی ہوگی کہ بھوکے بیٹے کو کس طرح دیکھ سکے؟ عنایت اللہ نے اندر آ کر سب سے پہلے روٹی والے رومال کو کھولا تو اس میں کچھ نہ تھا۔ خاموش باہر چلا گیا۔ گلی میں سے گزر رہا تھا کہ سامنے خان صاحب کے مکان میں سینکڑوں مسلمانوں کا اجتماع تھا۔ متنوع پھل' قسم قسم کی مٹھائیاں میزوں پر چنی رکھی تھیں کہ آج خان صاحب کے بچے کی پہلی افطاری کی تقریب تھی۔ یہ دو وقت کا بھوکا یتیم' انہیں دیکھتا ہوا چلا گیا کہ چوک میں کچھ بوجھ مل جائے تو ایک پیسے کے چنے لے سکے۔

☆☆☆

سلیم! تم نے مائی بھولی کو دیکھا ہے؟ وہ اندھی بڑھیا جو پاگل ہو رہی ہے۔ لیکن تم نے اس کے بیٹے کو شاید نہیں دیکھا۔ اٹھارہ سال کا نوجوان بیٹا۔ اس کا باپ مدت ہوئی چالی پر سے گر کر مر گیا تھا۔ عمارت بنوانے والے نے دوسرے دن اور مزدور کام پر لگا لیا اور کسی کو خبر تک بھی نہ ہوئی کہ کس کا سہاگ لٹ گیا اور کون یتیم ہو گیا۔ اس بچہ کو مائی بھولی نے بڑی مشقت سے چرخہ کات کات کر پالا تھا۔ جس سال بڑے زور کا انفلوئنزا پھیلا تھا' وہ لڑکا بھی بیمار ہو گیا۔ محلہ میں ایک حکیم جی تھے۔ وہ غریبوں کو نسخہ مفت لکھ دیا کرتے تھے۔ بھولی وہاں سے نسخہ تو لکھوا لائی لیکن اٹھنی کے پیسے پاس نہ تھے کہ دوائی خرید سکے۔ سلیم! باور کرو کہ اس نے محلے کے ایک ایک گھر میں جا کر منتیں کیں کہ کہیں سے کچھ پیسے قرض مل جائیں۔ لیکن کسی نے کچھ نہ دیا۔ نسخہ ہاتھ میں تھا اور سامنے جوان بیٹا جان توڑ رہا تھا۔ بچارا تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ یہ اس دن کا واقعہ ہے جس دن حاجیوں کی اسپیشل ٹرین روانہ ہوئی تھی اور سینکڑوں روپوں کے پھول اسٹیشن پر بکھرے پڑے تھے۔

☆☆☆

اور تم نے رضیہ بچاری کا پیغام تو اگلے دنوں خود اپنے کانوں سے سن لیا تھا۔ ذرا اندازہ لگاؤ کہ اسے جوان بھائی کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے لیکن اس کے پاس اتنے کپڑے نہیں کہ تن ڈھانپ کر گھر کی چاردیواری سے باہر نکل سکے۔ جب اس نے کپڑے بھی مستعار مانگے تھے تو ظاہر ہے کہ بچاری کے پاس زادِراہ کیا ہوگا۔ اس نے گاؤں کے چوکیدار کو کہلا بھیجا کہ وہ اس کے ساتھ جائے لیکن جب اسے معلوم تھا کہ رضیہ کے پاس کچھ نہیں تو وہ بلا اجرت کیسے ساتھ چلا جاتا؟ گاؤں میں دور نزدیک کے رشتہ دار بھی تھے لیکن کسے فرصت تھی کہ اس کی مصیبت میں اس کے ساتھ ہو لے؟ سارا گاؤں فتو خاں نمبردار کے لڑکے کی شادی کی تیاری میں مصروف تھا۔ غریب اکیلی' چلچلاتی دھوپ میں پیدل روانہ ہوگئی کہ مرنے والے کا منہ تو دیکھ لے۔ (یہ وہی رضیہ تھی جس نے بچپن میں اپنے مرحوم باپ کی معیت میں جو (''شمش العلماء'' تھے' دو حج کئے تھے)۔ اور یہ اس گاؤں کا واقعہ ہے جس کے مسلمان مذہبی معاملات میں اپنے کٹرپن میں مشہور ہیں۔ لیکن وہ ''مذہبی معاملات'' کیا ہیں؟ ذرا سن لو۔ مقلد اور غیر مقلد کے جھگڑے تو وہاں شروع سے چلے آتے تھے۔ اس دفعہ جو میں وہاں گیا ہوں تو ایک اور جھگڑا سننے میں آیا۔ خود مقلدوں کے ہاں بھی دو پارٹیاں بن رہی تھیں اور آپس میں سر پھٹول تک نوبت پہنچ گئی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک ''عظیم الشان'' مسئلہ کے اختلاف کی وجہ سے یہ تنازعہ پیدا ہوا ہے۔ کہیں سے ایک مولوی صاحب تشریف لائے۔ یہ مولوی صاحب بقول ایک گروہ کے بہت ''بھاری'' مولوی تھے۔ تین تین کوس تک ان کی آواز جاتی تھی۔ انہوں نے مسئلہ بیان کیا کہ مسجد کی شان رسولؐ اللہ کی شان سے بڑی ہے۔ کیونکہ رسولؐ اللہ خود مسجد میں چل کر آتے تھے اور مسجد کبھی ان کے پاس چل کر نہیں جاتی تھی۔ گاؤں کے مولوی صاحب کو اس سے اختلاف تھا۔ وہ رسولؐ اللہ کی شان کو مسجد کی شان سے بڑا سمجھتے تھے۔ پھر کیا تھا' دو پارٹیاں بن گئیں۔ باہمی جھگڑے ہوئے' لڑائیاں ہوئیں' مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی۔ قریب سال بھر ہو گیا یہ آگ آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہے اور ہر فریق اس مساعی حسنہ کو ''جہاد عظیم'' قرار دے رہا ہے۔ اسی باہمی تشتت و

انتشار کا نتیجہ ہے کہ کھیت ویران ہو رہے ہیں۔ فصلیں تباہ ہو چکی ہیں۔ زمین کا بیشتر حصہ سکھوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ بقایا رہن رکھا ہوا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد تم دیکھو گے کہ سکھ تمام گاؤں کے مالک بن جائیں گے اور یہ ''دین دار'' مسلمان ان کے مزارعہ ہو جائیں گے۔ اس پر مولوی صاحب انہیں مبارک باد دیں گے کہ انہوں نے یہاں کی زمین بیچ کر بہشت میں مکان خرید لیا۔ اس لئے یہ سودا خسارے کا نہیں۔

تم کہو گے کہ یہ تو جہلا کی باتیں ہیں۔ لیکن تمہیں وہ خطبہء جمعہ بھی تو یاد ہو گا جو شہر کی جامع مسجد میں شعبان المعظم کے مبارک مہینے کی تقریب پر تم نے خود سنا تھا۔ جناب خطیب نے' جو خدا کے فضل سے دیوبند کے فارغ التحصیل مولوی صاحب ہیں اور جن کے پاس اپنے بیان کی تائید میں سینکڑوں حوالے بھی موجود تھے' یہی فرمایا تھا کہ ''شب برات'' ایک ایسی رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ پکار پکار کہتا ہے کہ میرے بندے مجھ سے جو جی میں آئے مانگیں۔ میں ہر ایک کی طلب کو پورا کروں گا۔ لہٰذا جس شخص نے اس رات میں پچاس نفل پڑھ کر مغفرت کی دعا مانگ لی اس کی نجات کا اللہ تعالیٰ خود ذمہ ہے''۔ اس کے بعد تمہیں یاد ہو گا کہ مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انہوں نے فرمایا تھا کہ رحمت خداوندی کے اس بحر ذخار میں ہر ایک کا حصہ برابر ہو گا۔ لیکن ایک سوختہ بخت اس سے محروم رہ جائے گا۔ لوگوں کی آنکھیں اوپر کو اٹھیں کہ معلوم کریں کہ وہ کون بدنصیب ہو گا جو ابر رحمت کی ایسی گہر باری سے فیض یاب نہ ہو سکے گا؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ ہاں ایک' اور صرف ایک شخص اس رحمت سے محروم رہ جائے گا۔ یعنی وہ جس کا پاجامہ اس کے ٹخنوں سے نیچے ہو گا۔ یہ تو سلیم! ''جہلا'' کی باتیں نہ تھیں اور نہ ہی مولوی صاحب یہ کچھ اپنی طرف سے بیان کر رہے تھے۔ انہیں یہ سب کچھ ''عین اسلام'' کہہ کر پڑھایا گیا تھا اور وہ اسی کو ''عین اسلام'' سمجھ کر آگے پہنچا رہے تھے! ہاں! تو میں تمہیں رضیہ بی بی کی بپتا کی داستان سنا رہا تھا اور ایک رضیہ ہی پر کیا موقوف ہے۔ ذرا اپنے گرد و پیش نظر دوڑاؤ اور دیکھو کہ اس قسم کے کتنے واقعات ہر روز تمہارے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔ سو عزیزم! جس سوسائٹی کا نظام یہ ہو اس کے متعلق یہ سوال اٹھانا کہ ان کی نمازیں اور ان کے روزے' ان کی زکوٰۃ اور ان کے حج یعنی ان کے ''اعمال حسنہ'' وہ نتائج کیوں نہیں پیدا کرتی جو ہونے چاہئیں تھے' کچھ تعجب انگیز نہیں۔ سلیم! میں پھر کہتا ہوں اور تم اسے غور سے سمجھنے کی کوشش کرو کہ اسلام ایک نظام زندگی ہے۔ دنیا کے مذاہب جن میں انسانی تصرفات ہو چکے ہیں' مذہب کو محض انفرادی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام ایک ایسا معاشرہ (سوسائٹی) قائم کرنا چاہتا ہے جو نوع انسان کی ربوبیت (پرورش) کا ذمہ لے۔ اس مقصد عظیم کے لئے اسلام ہر عبد مومن کو اس کارگہء حیات کی عظیم الشان مشینری کا اہم اور کارآمد پرزہ قرار دیتا ہے جس کی ہر حرکت اور جنبش کا اثر تمام مشینری پر پڑتا ہے۔ اگر ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ صالح (محکم اور درست) ہے تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مشینری بھی ایک ضبط و ربط کے ماتحت چلے اور اس کا جیتا جاگتا نتیجہ گھڑی کے ڈائل کی طرح سامنے آ جائے۔ لیکن اگر یہ پرزے الگ الگ پڑے رہیں تو خواہ ان میں سے ہر ایک پرزہ الماس و یاقوت کا کیوں نہ ہو' مشینری بیکار ہو جائے گی۔ آج ہماری مشینری بیکار ہو رہی ہے اور یہ نتیجہ ہے اس عملی رہبانیت کا جو مسلمانوں کے عقائد و

اعمال میں سرایت کر چکی ہے۔ سلیم! غور سے قرآن کریم کا مطالعہ کرو تو تم پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ کسی قوم پر ذلت ومسکنت اور افلاس ونکبت کا چھا جانا اور پھر اس قوم کا اس حالت پر مطمئن ہو جانا، خدا کا غضب ہے، اللہ کا عذاب ہے۔ اور یہ تو تم سمجھتے ہی ہو کہ ایک مغضوب علیہ قوم محض بے روح نمازوں اور رسمی روزوں کے بل بوتے پر اپنے آپ کو منعم علیہ قرار نہیں دے سکتی۔ جب اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ایمان اور عمل صالح سے استخلاف فی الارض کی زندگی عطا کرے گا تو ظاہر ہے کہ جس ایمان وعمل کا نتیجہ شوکت وعظمت، تمکن واستخلاف نہیں (یا وہ اس حالت کی طرف رفتہ رفتہ نہیں لئے جا رہے) وہ ایمان، ایمان اور وہ عمل، عمل صالح نہیں ہوسکتا۔ اس کے سوا تم کسی اور نتیجے تک پہنچ ہی نہیں سکتے' کیونکہ اللہ کے وعدے تو بہرحال سچے ہیں اور اس کا قانون اٹل۔ سلیم! ذرا انسانیت کے معراج کبریٰ یعنی دور رسالتؐ کی تاریخ پر نگاہ ڈالو۔ وہ کون سا خاص پروگرام تھا جسے کانفرنسوں اور انجمنوں نے مرتب کر کے قوم کے سامنے رکھا تھا؟ یہی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ہی تو تھا جس نے چند سال کے عرصے میں نہ صرف اس قوم کی تمدنی، اخلاقی اور معاشرتی حالت ہی میں انقلاب پیدا کر دیا، بلکہ ان کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بھی کایا پلٹ دی اور کھجوروں کے ستو کھا کر گزارہ کرنے والی قوم، قیصر وکسریٰ کی سلطنتوں کی وارث بن گئی۔ ان ہی سیدھے سادے اعمال نے ان کے اندر وہ انقلاب پیدا کر دیا جو ایک مرد مومن کی نگاہ میں تقدیریں بدل دینے والی قوت پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ تمام اعمال درحقیقت مختلف اجزاء تھے اس پروگرام کے جس کا عنوان (یعنی مقصود آخر) قرآن کے پہلے چار الفاظ پر مشتمل ہے۔ یعنی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1) وجہ ستائش اللہ کا وہ پروگرام (نظام) ہے جو دنیا میں خدا کی ربوبیت عامہ (نوع انسان کی پرورش وتربیت) کا مظہر ہے۔ لہٰذا، جو اعمال اس نظام کے قیام کا ذریعہ نہیں بنتے وہ بے روح رسموں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔

☆☆☆

سلیم! ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر سمجھ لو کہ میرا مقصد یہ نہیں کہ اعمال اسلامی کا ماحصل محض اسی دنیا کی فلاح وکامیابی، غلبہ وتسلط ہے۔ ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر خدا کی بادشاہت اور فرعون کی حکومت میں فرق کیا ہوا؟ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اعمال اسلامی کا لازمی اور فطری نتیجہ اس دنیا میں حکومت وسطوت اور شوکت وعظمت کی زندگی بھی ہے اور اس کے بعد کی دنیا میں سرخروئی اور آبرومندی کی زندگی بھی۔ اگر ہمارے اعمال اس دنیا میں شوکت وعظمت پیدا نہیں کرتے تو ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارے اعمال اسلام کی میزان میں پورے نہیں اترتے۔

☆☆☆

سلیم! تم پوچھتے ہو کہ بالآخر یہ عذاب کی زندگی ہم پر مسلط کیوں ہوگئی۔ حیران ہوں کہ تم اب تک اتنی سی بات بھی نہ سمجھ سکے۔ اس سے تم متفق ہو گے کہ قرآن کا مقصد لوگوں کو تمام خودساختہ سلاسل واغلال سے آزاد کر کے ان سے صرف قانون خداوندی کی اطاعت کرانا تھا۔ لیکن سلیم! تم ذرا اپنی تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھو کہ جس انسانی استبداد کو مٹانے کے

لئے اسلام آیا تھا' کن کن شاہراہوں سے وہی استبداد امت پر مسلط کیا گیا۔ اور قیامت یہ کہ اس استبداد کا تسلط بیشتر مذہب کی آڑ میں ہوا اور ہر وہ طوق جسے اتار پھینکنے کے لئے قرآن آیا تھا اسے عین اسلامی بنا کر مسلمانوں کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ تم سمجھتے ہو کہ خدا کی میزان میں یہ جرم کچھ ایسا کم وزنی تھا کہ یونہی معاف کر دیا جاتا؟ امم گذشتہ جن جرائم کی پاداش میں ذلت و مسکنت کے عذاب میں گرفتار ہوئی تھیں' کیا وہ اسی قسم کے جرائم نہ تھے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ فطرت کسی کی سوتیلی ماں ہے کہ وہ ایک بچے کے ساتھ ایک قسم کا اور دوسرے کے ساتھ دوسری قسم کا سلوک کرے گی۔ اس کے قانون اٹل ہیں اور ان کا ہر ایک پر یکساں طور سے اطلاق ہوتا ہے۔ پہلوں نے یہی کچھ کیا تو ان پر عذاب آیا۔ جب مسلمانوں نے بھی وہی کچھ کیا تو ان پر عذاب کیوں نہ آتا؟ ان پر تو بلکہ اور بھی زیادہ سختی سے عذاب آنا چاہئے تھا کہ ان کے پاس قانون خداوندی کا ضابطہ اپنی اصلی اور مکمل شکل میں راہ نمائی کے لئے موجود تھا' لیکن انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا۔ کیا اس کی سزا اس سے کچھ مختلف ہونی چاہئے؟ انہیں وراثت کتاب کے لئے منتخب کیا گیا۔ نوع انسان کے لئے بہترین امت قرار دیا گیا۔ لیکن سب ایمان وعمل کے بدلے میں' نہ صرف نام رکھوانے کے عوض۔ اس کے باوجود تم پوچھتے ہو کہ اس قوم پر خدا کا عذاب کیوں مسلط ہوا؟ سلیم! اخوت' مساوات' حریت' وحدت انسانی' جماعتی زندگی' مرکزیت' اطاعت' فرد کا ملت کے لئے سب کچھ کرنا اور ملت کا افراد کی ربوبیت کا سامان فراہم کرنا۔ یہ تھیں نظام حقیقی کی خصوصیات۔ تم دیکھتے ہو کہ مسلمان اس منشاء الٰہی کو کب سے بھولے ہوئے ہیں۔ چھوڑ دو ابتدائی دور ہمایوں کے مختصر سے زمانے کو اور اس کے بعد قرآن کریم کی کسوٹی سے پرکھتے جاؤ' امت مسلمہ کے ایک ایک عمل کو۔ حقیقت تمہارے سامنے بے نقاب ہوجائے گی۔

لیکن بایں ہمہ' عزیزم! ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ جس قرآن کی رو سے ایک مرتبہ وہ نظام قائم ہوا تھا وہی قرآن آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر آج بھی مسلمان اس نکتہ کو سمجھ لیں تو پھر دیکھو ان کی نمازیں اور ان کے روزے کس طرح وہی نتائج پیدا کرتے ہیں جن کے دیکھنے کے تم اور ہر دردمند مسلمان متمنی ہے۔ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴿۹۶﴾ (7:96) ''اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے قوانین خداوندی کی صداقت کو جھٹلایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے قانون مکافات نے انہیں ان کے اعمال کی وجہ سے پکڑ لیا۔'' اس ایمان وتقویٰ کی حقیقت تمہیں قرآن کریم سے ملے گی' بشرطیکہ تم اسے' تمام غیر قرآنی تصورات کو ذہن سے نکال کر سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس لئے کہ ؎

سمجھے گا نہ تو جب تک بے رنگ نہ ہو ادراک　　کھویا گیا جو مطلب ہفتاد و دو ملت میں

(اقبال)

والسلام (نومبر 1939ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

روزے تم پر فرض کئے گئے ہیں

(مفہوم القرآن، سورۃ البقرہ، آیات 183 تا 188)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَی الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَهٗ فِدۡیَۃٌ طَعَامُ مِسۡکِیۡنٍ ؕ فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَهُوَ خَیۡرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۴﴾ (2:183-184)

لیکن میدانِ جنگ میں ثبات واستقامت کا سوال ہو، یا معاشرتی اور معاشی دنیا میں نظامِ عدل ومساوات کا قیام، یہ صرف اُسی صورت میں ممکن ہے کہ جب تمہیں اپنے آپ پر ضبط ہو۔ یعنی جب کبھی ایسا ہو کہ تمہارے کسی طبیعی (حیوانی) تقاضا اور بلند انسانی قدر میں ٹکراؤ ہو، تو تم اس قدر کو طبیعی تقاضا پر ترجیح دو۔ نیز تم جفاکشی اور مُشقت طلبی کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاؤ۔ اس مقصد کے لئے تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلی اقوام پر فرض کئے گئے تھے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کے قابل ہو سکو، اور زندگی کے سفر میں راستے کے خطرات سے محفوظ رہو۔ یہ روزے گنتی کے دنوں کے ہیں (گنتی کا تعین، بجائے خویش، ڈسپلن پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے)۔ پھر، جو کوئی تم میں سے مریض ہو، تو وہ دوسرے دنوں میں اس گنتی کو پورا کرلے۔ لیکن اگر شکل یہ ہو کہ ایک شخص نہ تو بیمار ہے اور نہ ہی حالتِ سفر میں، لیکن اُس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ روزے کو بہ مشقت نباہ سکتا ہے (تو اُس کے لئے دوسرے اوقات میں روزے پورے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)۔ اسے چاہئے کہ روزے کے عوض، کسی حاجتمند کی روٹی کا انتظام کردے (اس سے، کم از کم، معذور اشخاص کا قلبی تعلق، اِس اجتماعی فریضہ کے ساتھ قائم رہے گا)۔

یہ ظاہر ہے کہ اس بات کا فیصلہ قانونی طور پر نہیں کیا جا سکتا کہ تم روزہ بہ مشقت نباہ سکتے ہو۔ یہ چیز تمہارے اپنے فیصلہ کرنے کی ہے۔ لہٰذا اپنی حالت کا جائزہ تم خود لو۔ اگر تم دیکھو کہ صورت بین بین ہے، تو پھر تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے، خواہ اس میں (مقابلۃً) تھوڑی سی مشقت بھی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ جو مقصد روزے سے حاصل ہو سکتا ہے وہ اُس کے فدیہ سے نہیں ہو سکتا___ بشرطیکہ تم روزے کی حکمت سے واقف ہو۔

شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الۡهُدٰى وَالۡفُرۡقَانِ‌ۚ فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَـصُمۡهُ‌ ؕ وَمَنۡ كَانَ مَرِيۡضًا اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَيَّامٍ اُخَرَ‌ؕ يُرِيۡدُ اللّٰهُ بِكُمُ الۡيُسۡرَ وَلَا يُرِيۡدُ بِكُمُ الۡعُسۡرَ وَلِتُكۡمِلُوا الۡعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰٮكُمۡ وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۱۸۵﴾ (2:185)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ اس اجتماعی اور عسکری ٹریننگ (اور تربیتِ نفس) کے لیے رمضان کے مہینے کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ اس لئے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی تھی ـــ وہ قرآن جو تمام نوعِ انسانی کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ایسی راہ بتاتا ہے جو واضح اور اُبھری ہوئی ہے، اور جو مستقل اقدار کے پیمانے پیش کرتا ہے تاکہ حق اور باطل میں تمیز ہوتی رہے۔ روزوں کا نظم وضبط، اس عظیم پروگرام کے لئے مستعد رہنے کی سالانہ ٹریننگ ہے۔ سو جو شخص، اس مہینے میں، اپنے گھر پر موجود ہو، تو اُسے چاہئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ لیکن جو مریض ہو، یا حالتِ سفر میں، تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ (اور جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتا ہو اس کے متعلق پہلے کہا جا چکا ہے۔ یہ رعایتیں اس لئے ہیں کہ) خدا تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے، سختی اور تنگی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے تم دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لیا کرو۔

پھر سُن لو کہ روزے محض رسم پوری کرنے کے لئے نہیں۔ ان سے مقصد یہ ہے کہ تم اِس قابل ہو جاؤ کہ، خدا نے جو تمہیں راہ نمائی عطا کی ہے، اُس کے ذریعے تم قانونِ خداوندی کو ساری دنیا کے قوانین سے بلند کر سکو (9:33)۔ اور اس مقصد کے لئے تم جو کوشش کرو، وہ بھرپور نتائج کی حامل ہو۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىۡ عَنِّىۡ فَاِنِّىۡ قَرِيۡبٌ‌ؕ اُجِيۡبُ دَعۡوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ‌ۙ فَلۡيَسۡتَجِيۡبُوۡا لِىۡ وَلۡيُؤۡمِنُوۡا بِىۡ لَعَلَّهُمۡ يَرۡشُدُوۡنَ ﴿۱۸۶﴾ (2:186)

نہ ہی روزوں کے حکم سے، تمہارے ذہن میں یہ خیال پیدا ہونا چاہئے کہ، مادی لذتوں اور جسمانی ضرورتوں کے ترک کر دینے سے اِنسان خدا کا مُقرب بن جاتا ہے (جیسا کہ مسلکِ خانقاہیت میں، مختلف ریاضتوں اور مشقتوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے)۔ (اے رسول ﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق دریافت کریں تو اُن سے کہہ دیں کہ میں ہر وقت ان کے قریب ہوں۔ (وہ اس طرح کہ) جب بھی کوئی شخص، اپنی راہ نمائی کے لئے مجھے پکارتا ہے تو، میرا قانونِ ہدایت جو قرآن کے اندر محفوظ ہے، اُس کی پکار کا جواب دیتا ہے (اور اُبھر کر اُس کے سامنے آجاتا ہے)۔ لہٰذا، اِن سے کہہ دو کہ قُربِ خداوندی کا طریقہ یہ ہے کہ یہ لوگ میرے قانون کی صداقت پر یقینِ محکم رکھتے ہوئے، اس کی پوری پوری اطاعت کریں (7:56، 8:24، 16-32:15، 40:60، 42:26)۔ یہ ہے وہ طریق جس سے یہ دلائل و براہین کی رُو سے، عقل و فکر کی روشنی میں، زندگی کے صحیح راستے پر پختگی سے چلتے رہیں گے۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے اعمال سے ہوگا (3:194)۔

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾ (2:187)

یہ بھی سمجھ لو کہ روزہ دن ہی دن کا ہے۔ رات کے وقت نہ کھانے پینے کی ممانعت ہے نہ ہی بیویوں کی طرف رجوع کرنے کی۔ بیویوں سے جنسی اختلاط، ''قربِ خداوندی'' کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتا (یہ بھی مسلکِ خانقاہیت کا پیدا کردہ تصوّر ہے)۔ میاں بیوی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے، اور ایسا قریبی رشتہ کہ اِن کے درمیان کوئی تیسرا حائل نہیں ہوسکتا۔ اللہ جانتا ہے کہ نفس انسانی کے تقاضے کیا ہیں اور مسلکِ رہبانیت میں انسان کے دل میں کس کس قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ خود اپنے آپ سے خیانت کرتا رہتا ہے (57:27)۔ لہٰذا، خدا کا قانون، اس بارے میں، اِنسانوں کی خودساختہ حدود سے آگے بڑھتا ہے، اور تمہارے دل میں جو وساوس پیدا ہو رہے تھے، اُن سے درگزر کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ تم، رات کے وقت، منشائے قانونِ خداوندی کے مطابق، اپنی بیویوں کے پاس بھی جاسکتے ہو اور کھا پی بھی سکتے ہو، تا آنکہ صبح کی سفیدی رات کی سیاہی سے نمایاں ہوجائے۔ اس کے بعد، رات تک روزہ پورا کرو۔ لیکن اگر تم، اِس ٹریننگ کے کسی خاص کورس کے لئے تربیت واطاعت کے مراکز (مساجد) میں رُکے ہوئے ہو، تا کہ تم اُلجھے ہوئے معاملات کو اچھی طرح سُلجھا سکو، تو پھر تم اِن راتوں میں بھی بیویوں سے اختلاط نہ کرو (اور اپنی توجہ کو پوری یک سوئی سے معاملاتِ پیشِ نظر پر مرکوز رکھو)۔

بس یہ ہیں وہ حدود جو اِس باب میں قانونِ خداوندی نے مقرر کر دی ہیں۔ اِن کی نگہداشت کرو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام وقوانین کو نمایاں طور پر بیان کر دیتا ہے تا کہ لوگ اِن کی پوری پوری نگہداشت کر سکیں۔

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿١٨٨﴾ (2:188)

اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کہ (جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے) روزے سے مقصد یہ ہے کہ تم میں ایسا ضبطِ نفس پیدا ہوجائے کہ تم، زندگی کے ہر گوشے میں، جائز اور ناجائز میں تمیز کرسکو، اور، خواہ تمہاری مفاد پرستی کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو، ناجائز کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو۔ (مثلاً) آپس میں ایک دوسرے کا مال، ناجائز طریق پر نہ کھاؤ۔ یا اگر معاملہ عدالت تک جاچکا ہے، تو ایسا نہ کرو کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ لے لو جس سے دوسروں کا کچھ مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے، حالانکہ تم جانتے ہو کہ جو مال اس طرح حاصل کیا جائے اس کے نتائج کیا ہوا کرتے ہیں؟

روزوں سے تمہاری اس قسم کی تربیتِ ذات مقصود ہے۔

پرویز علیہ الرحمۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

درسِ قرآن

(سورۃ النساء، آیت نمبر: 34)

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعۡضَہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ وَّ بِمَاۤ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِہِمۡ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَیۡبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ ؕ وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَہُنَّ فَعِظُوۡہُنَّ وَاہۡجُرُوۡہُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡہُنَّ ۚ فَاِنۡ اَطَعۡنَکُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَیۡہِنَّ سَبِیۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیۡرًا ﴿۳۴﴾

عزیزانِ من! آج اگست 1970ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ النساء کی 34 ویں آیت سے ہو رہا ہے: (4:34)۔

قرآنی تعلیم کے برعکس (4:34) کا وہ ترجمہ جو ہر جگہ ہزار سال سے مستند سمجھا جاتا ہے:

جیسا کہ میں نے سابقہ درس کے آخر میں عرض کیا تھا کہ بڑی اہم آیت سامنے آ رہی ہے۔ اہم اس اعتبار سے ہے کہ اس آیت کے جو معنی کیے جاتے ہیں' اس کی رُو سے جو پوزیشن سامنے آتی ہے' وہ قرآنِ کریم کی اس موضوع پر ساری تعلیم کے خلاف ہے لیکن ان معنی اور اس مفہوم کو ایسا مستند اور متفق علیہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہ کوئی ہٹ سکتا ہے' نہ سوچ سکتا ہے' نہ کوئی اور مفہوم لے سکتا ہے اور یہ چیز ہمارے ہاں ہزار برس سے چلی آ رہی ہے۔ آیت یہ ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ (4:34)۔ اب جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا' کوئی سا ترجمہ اٹھا کر دیکھیے' اس میں یہ لکھا ملے گا کہ ''مرد عورتوں پر حاکم ہیں بلکہ داروغہ (Darogah) ہیں'' کیونکہ اس قَوّٰمُوۡنَ کے لیے عربی زبان کی تفاسیر میں دو الفاظ متسلّطین اور مسیطرین [1] ملتے ہیں اس پر ہمارے مترجمین نے ترجمہ کر دیا کہ مرد عورتوں پر حاکم بھی ہیں اور داروغہ بھی یعنی 'مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ قسم کے حاکم ہیں'۔ آگے کہا ہے کہ: بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعۡضَہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ (4:34) اللہ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے۔ میں آپ کو وہ ترجمہ دے رہا ہوں جو آپ کو قرآنِ کریم کے ہر ترجمہ میں ملے گا 'مرد عورتوں پر حاکم اور داروغہ ہیں' اس لیے کہ خدا نے انہیں عورتوں پر فضیلت دی ہے' ان کو عورتوں سے افضل بنایا ہے اور اس لیے

---

[1] تفسیر کشاف کے مصنف علامہ زمخشری نے قوّامون کے لیے مرادف مسیطرین یعنی داروغے اور تفسیر جلالین میں اس کے لیے مرادف متسلّطین یعنی عورتوں پر غلبہ و تسلط کے مالک مسلّط لکھے ہیں۔ اس سے ہمارے مترجمین نے قوّامون کا مفہوم مسیطرین اور متسلّطین بتایا۔

کہ: وَّبِمَآ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ ؕ (4:34) وہ ان کے اوپر اپنا مال خرچ کرتے ہیں فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَيۡبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (4:34) نیک عورتیں وہ ہیں جو خاوندوں کی اطاعت گزار ہیں اور جس چیز کا خدا نے انہیں حفاظت کرنے کے لیے کہا ہے' وہ شوہروں کی عدم موجودگی میں اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ اور پھر آگے کہا ہے کہ وَالّٰتِىۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ فَعِظُوۡهُنَّ وَاهۡجُرُوۡهُنَّ فِى الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡهُنَّ‌ ۚ (4:34) اور اگر تم ان کی طرف سے دیکھو کہ وہ ذرا بھی سرکشی کرتی ہیں تو ان کو پہلے سمجھاؤ بجھاؤ پھر ان کو خوابگاہوں سے الگ کردو اور پھر ان کو مارو پیٹو۔ فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَيۡهِنَّ سَبِيۡلًا ؕ (4:34) ہاں جب وہ اطاعت اختیار کرلیں تو بس پھر اس کے بعد کچھ نہیں کہنا۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيۡرًا (4:34) بے شک اللہ بہت ہی بالا دست اور احکم الحاکمین ہے۔

عزیزانِ من! یہ ہے وہ آیت جہاں سے درس کا آغاز ہو رہا ہے اور جس کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ کوئی سا ترجمہ اٹھایئے' یہی ترجمہ ملے گا اور کوئی سی تفسیر لیجیے وہ اسی کی تشریح میں آپ کو ملے گی۔ آپ کو محراب و منبر سے دہراتے ہوئے ملیں گے کہ اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے ہیں وہ اسے کہیں اور نہیں مل سکتے' جتنا بلند مرتبہ اس نے عطا کیا ہے' نہ اس سے پہلے کی تاریخ میں کہیں اس کی مثال ملتی ہے' نہ اس کے بعد آپ کو اس کی مثال ملے گی اور بڑے فخر سے اس چیز کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک متفق علیہ چیز ہے' ہر جگہ آپ انہیں یہ کہتے ہوئے سنیں گے۔ اور اس کے ساتھ ہی اسی عورت کے متعلق یہ چیز بھی ان کے ہاں متفق علیہ ہے کہ مرد ان پر داروغہ مقرر ہوئے ہیں' حاکم مقرر ہوئے ہیں اس لیے کہ ان کے اوپر خرچ کرتے ہیں۔ اگر ان میں ذرا سی سرکشی نظر آئے' انہیں سمجھاؤ بجھاؤ۔ یہ بات نہ سُنیں تو مارو پیٹو۔ یہ بھی اس کے ساتھ ہی کہا جارہا ہے۔ اب وہ جو اسلام نے حقوق دیئے ہیں' جو بلند مرتبہ دیا ہے' ایک طرف اس دعوے کو سامنے رکھیے' دوسری طرف قرآن حمید کی یہ آیت ہے' یہ کوئی مسئلہ مسائل والی بات نہیں' جسے کہتے ہیں کہ کوئی ہدیٰ اور قُدوہ کی بات نہیں ہے' یہ قرآن حمید کی ایک آیت ہے اور اس کا یہ ترجمہ لیا جاتا ہے۔

یورپ میں کیے گئے تراجم بھی ہمارے تراجم کی ہی عکاسی کرتے ہیں: یہ بات سمجھنے کی ہے:

جب آپ کے ہاں یہ ترجمہ کیا جاتا ہے تو پھر یورپ میں جتنے ترجمے ہوئے ہیں' ان میں بھی یہی کچھ ہے۔ عزیزانِ من! آپ سوچیے قبل اس کے کہ میں اس پہ آؤں کہ یہ آیت کیا ہے' اس کا مفہوم کیا ہے۔ آپ سوچیے کہ یہ دو باتیں جب آپ اپنے ہاں' اپنی مسجد اور حجرے میں بیٹھ کر کہیں گے' تو ہم جو جی میں آئے کہہ لیں' ساری دنیا کے سامنے کہہ لیں' جب ہم ایک طرف اسلام پہ کتاب شائع کریں گے' اس میں Women (عورت) کے متعلق Chapter (باب) آجائے گا تو اس میں ہم ساری دنیا سے یہ کہیں گے کہ اسلام نے جو مقام ان کو عطا کیا ہے' جو حقوق ان کو دیئے ہیں' وہ کہیں اور نہیں مل سکتے اور اس کے ساتھ ہی جب ہم ان کو قرآن مجید دیں گے' وہ اس میں یہ لکھا پائیں گے' خود انہوں نے بھی جو ترجمے کیے ہیں' ان میں بھی یہی کچھ کیا ہے' انہوں نے تو آپ کے ہاں سے یہ چیز لے کر ترجمہ کر دیا۔ تو کہاں زوج اور مؤدت کا مفہوم اور کہاں حاکم

اور محکوم اصولاً تو آپ اس چیز کو سوچیے۔

ابھی ذرا پہلے سورۃ البقرۃ میں آ گیا کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (2:228) جتنی ان کی ذمہ داریاں ہیں، ہر ذمہ داری کے مقابلے میں ان کا ایک حق ہے۔ سارے قرآن مجید میں ان کے لیے زوج کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہیں Complementary to each other (جو ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والی چیز ہو)۔ آپ داروغے کا تصور ذہن میں رکھیے اور پھر قرآن مجید کی ان آیات کو سامنے لائیے۔ یہ کس قدر تضاد ہے قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ میاں بیوی کا جو تعلق ہے، وہ باہمی مؤدت، سکینت اور رحمت کا ہے۔ مؤدت تو محبت سے بھی اگلا درجہ ہوتا ہے۔ وہ ایسا درجہ ہوتا ہے جسے یہ کہیے کہ 'تا کس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری' ❶ اس طرح سے ایک دوسرے کے اندر جذب ہو جانے کی جو کیفیت ہوتی ہے، وہ ہے مؤدت اور سکینت۔ گھر کے اندر، باہمی تعلقات کے اندر، کوئی چیز اضطراب انگیز نہیں، اس میں سکون ہے اور رحمت ہے۔ اس کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ رحمت تو آپ جانتے ہیں کہ خدا صاحبِ رحمت ہے، رحیم ہے، رسول ﷺ رحمت ہے، قرآن مجید رحمت ہے، اور میاں بیوی کے تعلقات کا نتیجہ رحمت ہے۔ ذرا سوچیے کہ کبھی حاکم اور محکوم کا بھی ایسا تعلق ہو سکتا ہے؟ کبھی کسی جیل خانے کے داروغہ اور قیدی کا آپس میں یہ تعلق ہو سکتا ہے؟ می نہ سزد خدائے را۔

یہ یہیں کھڑے ہو کر سوچنے کی بات آ جاتی ہے لیکن سوال تو پھر ہمارے سامنے وہی ہے کہ صاحب! ہزار برس سے یہ چیز تواتر سے، چلی آ رہی ہے۔ تفسیر لکھنے والے بہر حال عربی زبان بھی جانتے تھے، عالم تھے، ایسا بھی نہیں کہ کسی ایک نے لکھ دیا ہو، جس تفسیر کو اٹھا کر دیکھیے یہی کچھ لکھا ہوا ہے۔ تفاسیر کے بعد جو ہمارے ہاں ترجمہ کرنے والے بزرگ تھے، وہ عربی زبان کے بھی عالم تھے، اسلام کے بھی بہت بڑے عالم تھے، اُنہوں نے بھی ہمارے ہاں یہی ترجمہ کیا۔ عرب اپنے ہاں عربی زبان میں یہ پڑھ رہے ہیں اور یہی الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ اردو والے اس کا ترجمہ کر رہے ہیں، وہ بھی یہی کچھ کہہ رہے ہیں۔ تفسیریں اٹھا کر دیکھیے، ان میں بھی یہی لکھا ہوا ہے۔ تو ٹھیک ہے، اس کے بعد اگر کوئی شخص اس کے خلاف کچھ پیش کرتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ انوکھی سی بات آ گئی صاحب! یہ چیز اس آیت کے ضمن میں ہی نہیں، بلکہ پورے قرآن حکیم کے ضمن میں ہے۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ پھر یہ مفہوم کیسے مرتب ہوتا ہے۔

ہماری مرتب کردہ تفاسیر کا معیار پرکھنے کے لیے، ایک تفسیر کے تحریر و بیاں کی چند مثالیں:

یہ جسے آپ آگے چل کر ترجمہ کہتے ہیں، میں عرض کر دوں کہ تفاسیر میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے، آگے اسی سے ترجمہ بنتا ہے۔ اس کی مثال یہ (زمخشری کی) کشاف تفسیر لے لیجیے۔ وضاحت کرنے کے بعد اس میں یہ چیز ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34) میں قَوّٰمُوْنَ وہ ہیں جو متسلّطین، تسلط جمانے والے، تغلب جمانے والے ہیں۔ یہ اس قَوّٰمُوْنَ کا لفظ "متسلّطین" ہے۔ ہمارے ہاں ایک تفسیر ہے، اسے جلالین کہتے ہیں، چوں کہ لکھنے والے باپ اور بیٹا تھے، دونوں جلال

---

❶ تا کہ کوئی یہ نہ کہے کہ میں اور ہوں اور تم اور ہو۔

الدین۔لہٰذا اسے جلالین کہتے ہیں۔اس میں انداز یہ ہے کہ یہ تفسیر نہیں بلکہ قرآن حمید کے یہ جو الفاظ ہیں وہ ان کے مرادف' عربی کے دوسرے الفاظ' ساتھ ساتھ دیتے جارہے ہیں۔ہم تو اردو میں ترجمہ کریں گے۔یوں کہہ لیجیے کہ انہوں نے قرآنِ کریم کے الفاظ کا عربی میں ترجمہ کیا ہے' قرآن کریم کے لفظوں کے مرادف الفاظ' انہوں نے دیئے ہیں اور وہ قوسین میں دیتے چلے جاتے ہیں۔اب یہ سمجھنے کے لیے کہ قرآن کریم کے اس لفظ کے معنی کیا ہیں' اس کے مرادف عربی کا ایک دوسرا لفظ دیدیا تو گویا اس سے سمجھ لو کہ اس کے معنی کیا ہیں۔اس میں بھی جہاں ''قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآ'' لکھا ہے' اس کے آگے انہوں نے اس کا مرادف ''مسیطرین'' لکھا ہے۔مسیطرین اردو میں داروغے (Darogah) کو کہتے ہیں۔بات صاف ہوگئی کہ صاحب! وہ تفسیر لکھ رہے ہیں' اس میں وہ یہ بتارہے ہیں کہ قوامون' متسلّطین ہیں' یہ اس کا عربی مرادف دے رہے ہیں' تو اس میں وہ مسیطرین کہہ رہے ہیں۔اب ہمارے ہاں جنہوں نے ترجمہ کیا ہے' وہ یہاں سے دیکھیں گے۔کسی نے متسلّطین لیا تو حاکم کہا' کسی نے مسیطرین لیا' تو داروغہ کیا۔ان لفظوں کا یہ ترجمہ ٹھیک ہے۔بات یہ ہوئی کہ پھر یہ الفاظ کیسے آ گئے اور یہ چیز' میں نے کہا ہے' کہ ہمارے سامنے اس آیہ جلیلہ کے ضمن میں تو آ گئی۔

ہمارے ہاں قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق:

سارے قرآن حکیم کے ساتھ یہ ہوا ہے۔پہلے تفسیروں میں ہوا ہے اور ان تفاسیر کی رو سے جو دوسرے مرادف الفاظ قوسین میں یا ان کے نیچے لکھے گئے ہیں' پھر ان کا ہمارے ہاں اردو میں ترجمہ ہوا تو وہ چیز آ گئی۔اب ہم جو عام طور پر قرآن حکیم کو سمجھتے ہیں یا تو ان تراجم کی رُو سے سمجھتے ہیں اور یا پھر اگلی بات یہ ہوتی ہے کہ نہیں صاحب! عربی زبان سے واقف ہونا ضروری ہے۔ٹھیک ہے' ہم میں سے جو عربی زبان سے واقف ہو وہ اس طرح سے اسے سمجھے۔اور وہ جن کی زبان ہی عربی ہے' وہ جو ان کے عربی زبان میں مرادف لیے ہوئے ہیں' وہ جو عربی زبان میں ان کی تفسیریں لکھی ہوئی ہیں' سوال یہ ہے کہ وہ کس سے سمجھیں۔بات یہاں آ گئی کہ یہ تفسیریں کیسے لکھی گئیں کیونکہ یہ چیز سمجھ میں آئے گی' تو بات آگے چلے گی کہ اس تفسیر میں یہ مفہوم دیا ہوا ہے' پھر اس مفہوم کے مرادف لفظ کے لیے انہوں نے وہ لفظ دیا ہے' یہ ساتھ لکھا ہوا ہے۔اُدھر مرادف الفاظ کے ترجمے ہمارے ہاں' اہلِ زبان کے ہاں' عربی جاننے اور نہ جاننے والوں کے ہاں' اسی طرح ہوئے ہیں اور اس طرح قرآن حکیم کو سمجھا جارہا ہے۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں ایک اعتراض کا جواب:

معاف رکھیے گا' مجھے زیادہ وضاحت میں جانے کی ضرورت ہے' بات بڑی بنیادی ہے اور اُسی آیت کے اوپر نہیں بلکہ جہاں جہاں بھی آپ آگے دیکھیں گے کہ ان تفاسیر' ان تراجم' کے خلاف کوئی بات کہے گا' تو فوراً اعتراض سامنے آجائے گا کہ صاحب! کیا یہ ہزار برس قبل کے لوگ جانتے نہ تھے؟ عرب جن کی زبان عربی ہے' ان کو کیا ہو گیا تھا؟ کوئی ترجمہ اٹھا کر دیکھیے'

یہ اتنے اتنے بڑے عالم، اتنے اتنے بڑے ادیب ہیں، اس میں انہوں نے یہ لکھا ہے۔ یہ اعتراض وزنی نظر آتا ہے۔

قرآنِ کریم کی آیات کا مفہوم تفاسیر نے سمجھایا ہوا ہے۔ اب تو ہم تفاسیر کہتے ہیں۔ بہت سی تفسیریں ہیں، جب ہم بنیادی بات کہیں گے تو تفسیر کہیں گے اور سب سے پہلی مکمل وضاحت والی تفسیر، ہمارے ہاں امام طبری (225-311H/838-923 A.D.) کی ہے۔ یہ تیسری صدی ہجری کے امام ہیں۔ جب ہم امام کا لفظ لے لیں تو ایک امام تو شیعہ حضرات کے ہاں ہے، وہ بالکل الگ چیز ہے، وہ ان کے آئمہ ہیں۔ سنّی حضرات کے لیے امام کا لفظ تعظیماً استعمال ہوتا ہے جیسے عالم مفسر محدث، اور اصل میں کسی مخصوص دور کے اندر بھی، کوئی شخص جو ذرا آگے بڑھتا ہوتا تھا، اسے امام کہہ لیا جاتا تھا، اسے یوں سمجھیے کہ یہ لفظ Pioneer (پہل کار) کے معنی میں بھی استعمال ہو جاتا ہے۔ اس لیے جب نام کے ساتھ امام آئے تو اس سے کسی قسم کی وحشت نہیں طاری ہو جانی چاہیے کہ ان کی بات حرفِ آخر ہے، اس کے بعد تو ہم کچھ کہہ ہی نہیں سکتے، امام طبری (ابوجعفر محمد بن جریر الطبری) نے یہ کہہ دیا ہے۔ عزیزانِ من! الفاظ کا بڑا جادو ہوتا ہے۔ آج کے دور میں اگر وہ ہوتے اور انگریزی میں لکھتے تو ہم ان کو مسٹر طبری کہتے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یوں پکارنے سے ذہن میں وہ تصور نہیں آتا جو امام کہنے سے ذہن میں آتا ہے۔ الفاظ اس طرح سے، اپنا خاص تصور قائم کر دیتے ہیں، ذہن اس سے مسحور ہو جاتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے تین سو سال بعد لکھی گئی جامع تاریخ کی حقیقت

یہ ٹھیک ہے کہ وہ بہت بڑے عالم، بہت بڑے مفسر، بہت بڑے مورخ تھے اس لیے تو سب سے پہلے انہوں نے جامع تفسیر اور جامع تاریخ لکھی۔ یاد رکھیے گا کہ رسول اللہ ﷺ کے اس دنیا سے رخصت فرمانے کے تین سو سال بعد یہ تفسیر اور تاریخ لکھی جا رہی ہے اور اس تین سو سال کے اندر کوئی تحریری مواد نہیں ہے۔ یہ جتنی چیزیں چلی آ رہی ہیں انہیں روایات کہتے ہیں۔ یہ زبانی سلسلہ ہے کہ اُس نے ایک بات کہی، اس کے آگے دوسرے نے سنی، اس سے آگے تیسرے نے سنی، یہ سلسلہ پانچ چھ نسلوں تک چلا کہ اُس نے اِس طرح سے کہی، تین سو سال تک جتنے بھی سلسلے ممکن تھے وہ بنے۔ آپ کے ہاں جنہیں مجموعۂ احادیث کہا جاتا ہے، ان میں امام (محمد اسماعیل) بخاری (194-256/60ھ) کا سب سے پہلا مفصل مجموعہ ہے، وہ بھی تیسری صدی ہجری کے ہیں، ان میں بھی ہر حدیث کے ساتھ یہ ہے کہ مجھ سے فلاں نے یہ کہا، اُنہوں نے فلاں سے یہ سنا، انہوں نے فلاں سے یہ سنا اور اس طرح سے پانچ چھ سلسلوں سے، تین سو سال میں جتنے سلسلے ہو سکتے ہیں، کچھ باتیں صحابہؓ تک پہنچیں کچھ رسول اللہ ﷺ سے جا منسوب ہوئیں۔ اسی طرح تاریخ کے اندر بھی یہ چیز ہوئی۔ ہمارے تمام تاریخی واقعات یوں سنے ہوئے آگے چلتے آئے۔ اس میں کتنا عرصہ ہو گیا؟ یہ صرف اڑھائی تین سو سال کہنے سے ذہن کچھ صحیح بات نہیں سمجھتا۔ اسے یوں کہیے کہ جیسے اورنگ زیب (1618-1707ء) کے زمانے کی تاریخ آج لکھی جائے اور اس درمیان میں کوئی تحریری چیز نہ ہو۔

ہاں تو امامِ طبریؒ (ابوجعفر محمد بن جریر الطبری) (225-311H/838-923 A.D.) نے تفسیر لکھی اور ہر آیت کی

تفسیر میں یہ کہا کہ روایت میں یہ آیا ہے' یا تو یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا' اس آیت کی تشریح میں آپ ﷺ نے یہ فرمایا' یا کسی صحابہؓ کی طرف منسوب کیا کہ انہوں نے اس کے متعلق یہ کہا۔ غور فرمایئے کہ جس چیز کو امام (ابوجعفر محمد بن جریر) طبریؒ نے لکھا یا امام (محمد اسماعیل) بخاریؒ نے لکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا' حضور ﷺ کا یہ جو ارشادِ گرامی ہے' یہ زبانی روایت سے' تین سواڑھائی سو سال بعد' زبانی ان تک پہنچا ہے۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ احتیاط برتی کہ لکھنے کے بعد اس نے ہم سے کہا کہ فلاں نے کہا' اُس نے اس سے کہا' اُس نے اس سے کہا اور اس کے بعد سب سے آخر میں آ کر کہا کہ قال الرسول اللہ ﷺ کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا۔ یوں لکھنے کے بعد آخر میں احتیاطاً' وہ لکھ دیتے ہیں ''اوکما قال رسول اللہ ﷺ'' یا جیسا کہ بھیٔ رسول اللہ ﷺ نے کہا ہو۔ خود یہیں یہ بات آ گئی لیکن جو اگلا حصہ ہے ''اوکما قال رسول اللہ ﷺ'' یہ جو چیزیں ہیں' یہ تو نظر انداز ہو جاتی ہیں جونہی کوئی حدیث آپ کے سامنے آئے۔ وہ اب یہی تصور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا تھا۔ آپ ذرا سوچیے کہ کسی آیت کے متعلق اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اس کی تفسیر نبی اکرم ﷺ نے یہ فرمائی تھی' اس کے بعد کسے یہ کہنے کی جرأت ہو سکتی ہے کہ نہیں' اس کی یہ تفسیر نہیں ہو سکتی ہے (معاذ اللہ معاذ اللہ معاذ اللہ)۔

دورِ اولیٰ کی پہلی تاریخ اور قرآنِ حکیم کی پہلی تفسیر امام طبری نے لکھی:

اگر قرآنِ حکیم کی پوری تفسیر لکھی جائے اور اس میں ہر آیت کے متعلق یہ لکھا جائے' تو اس کے بعد پورے قرآنِ حکیم کے متعلق' سوچنے سمجھنے' اور غور و فکر کرنے کی' گنجائش ہی باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ تاریخ میں کوئی چیزیں ایسی آ جاتیں کہ وہ اس کے خلاف جاتیں جو اس تفسیر میں آئیں۔ ہوا یہ کہ پہلی تاریخ بھی امام (ابوجعفر محمد بن جریر) طبریؒ نے لکھی۔ اب یہ سمجھ لیجیے کہ تاریخ اور تفسیر کا باہمی تعلق کیا ہے۔

شانِ نزول کا عقیدہ اور اس سے پیدا ہونے والی الجھنیں

تفسیر کے لیے ہمارے ہاں ایک چیز ہے' اسے شانِ نزول کہتے ہیں مثلاً قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی ہے' اس کا شانِ نزول کیا ہے۔ شانِ نزول یہ ہوتا ہے کہ ایک واقعہ ہوا تھا اور اس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ تو اب اس آیت کا مفہوم' اس واقعہ سے متعلق ہو کر رہ گیا۔ اوبھئی! اس آیت کے معنی کیا ہیں؟ معنی کے لیے وہ واقعہ سمجھ لیجیے کہ کیا ہوا تھا۔ ''وہ واقعہ یوں ہوا تھا' اس پہ یہ آیت نازل ہوئی''۔ تو اب تفسیر میں دو قسم کی چیزیں آئیں یا تو یہی کہ اس کی تفسیر رسول اللہ ﷺ نے یوں فرما دی یا یہ کہ اس قسم کا ایک واقعہ ہوا تھا' اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی تھی تو اس واقعہ سے اس آیت کا مفہوم متعین ہوا۔ یہ جو سب سے پہلے تفسیر لکھی گئی' اس میں اور وہ جو ساتھ ہی تاریخ میں ان کے جو واقعات لکھے گئے یعنی ان آیات کی شانِ نزول لکھی گئی کہ فلاں آیت اس لیے نازل ہوئی کہ یوں جو ایک واقعہ ہوا تھا' اس کے متعلق خدا کا حکم چاہیے تھا تو یہ حکم اس کے متعلق نازل ہوا' یا یہ چیز ہے کہ اس کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے یہ تفسیر فرمائی تھی۔ یہ پہلی تفسیر اور پہلی تاریخ جو آپ

کے ہاں' مرتب ہوئی' دونوں ایک شخص نے مرتب کیں۔ یہ تیسری صدی ہجری کی بات ہے اور زبانی روایات کی مدد سے یہ چیز مرتب ہوئی تو اس میں یہ چیز آ گئی۔

گزشتہ ہزار برسوں میں لکھی جانے والی تمام تفاسیر' امام طبریؒ کے تتبع ہی پر لکھی جا رہی ہیں

جیسا میں نے عرض کیا کہ جب یہ چیز ہو جائے کہ یہ تفسیر رسول اللہ ﷺ کی ارشاد فرمودہ ہے یا اس واقعہ کے تابع یہ آیت آئی تھی گویا خدا نے خود اس واقعہ سے متعلق یہ حکم نازل کیا ہے تو جو کچھ اس میں لکھا گیا ہے' اس سے ایک انچ اِدھر اُدھر کوئی نہیں ہٹ سکتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ اس کے بعد یہ جتنی آپ کے ہاں تفاسیر ہیں' وہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں' لوگوں نے ہر دور میں لکھی ہیں' وہ اسی پہلی تفسیر کی طرح کے اوپر کہیے کہ غزلیں لکھی ہوئی ہیں' جسے کہتے ہیں کہ اسی کو Extend (وسیع) کیا ہے' اس کی زیادہ تفصیل دیدی ہے' کسی نے اس تفسیر کی حکمت اور غرض و غایت بتا دی ہے' کسی نے ان سے الگ احکام مستنبط کر لیے ہیں تو وہ اسی تفسیر کے احکام کی چیزیں آ گئیں۔ یہ جو انہوں نے اسی تفسیر سے معنی سمجھ کے مرادفات دیئے' تو انہوں نے کہا ہے کہ اس کے لیے دوسرا عربی زبان کا لفظ یہ ہو سکتا ہے۔ جتنی آپ کے ہاں اردو تفسیریں لکھیں' جب عربی کی تفاسیر کی یہ کیفیت ہوگی تو وہ تو بہر حال ہوگا ہی' ان کا وہ ترجمہ بھی اسی نہج پر ہوگا۔

تاریخ کے ایک موڑ پر قرآنی غور و فکر کے حامل انسانوں کی سوچ کو پامال کرنے کا حشر:

درمیان میں ایک دور آیا جب لوگوں نے کہا کہ صاحب! قرآنِ کریم کے تو ایک ایک صفحہ پہ لکھا ہوا ہے کہ غور کرو' فکر کرو' شعور سے کام لو' سمجھ سے کام لو' تفقہ سے کام لو تو یہ غور و فکر اور تفقہ کسی ایک دور سے تو مخصوص نہیں ہو سکتا' یہ تو ہر دور کے مسلمان کو' ہر دور کے انسان کو' قرآن کریم نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ (4:82) قرآن میں تم تدبر نہیں کرتے یعنی یہ فکری چیز' باہر کی دنیا سے متعلق ہی نہیں ہے' قرآن کریم میں تدبر کے متعلق' قرآن کریم نے خود تاکید کی ہے تو ہمیں اتنا تدبر کرنا چاہیے جو ہمیں ایک چیز ملتی ہے۔ یہ وہ گروہ تھا' جن کے متعلق ایک لیبل لگا۔ میں تاریخ میں نہیں جا رہا' کسی کو Defend (دفاع) نہیں کر رہا' یہ موضوع دوسرا ہے۔ انہیں معتزلہ کہا گیا کہ یہ قرآن کریم میں عقل و فکر سے کام لینے کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور پھر ان کے خلاف جو تحریک اٹھی' اس تحریک کی بنیاد یہ تھی' یہی جو میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ امام شافعی [1] اس تحریک کے Pioneer (پہل کار' امام) تھے یعنی بنیاد یہ تھی کہ جب ایک آیت کی رسول اللہ ﷺ کی تفسیر سامنے آ جائے' پھر اس کے بعد کسی کو کیا حق رہتا ہے کہ کہے کہ ہم اس میں مزید غور اور فکر اور تدبر سے یہ معنی سمجھے ہیں لہٰذا ان کا یہ کہنا شانِ رسالت ﷺ کے خلاف ہے' اس بات کا انکار ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تفسیر حرفِ آخر ہو سکتی ہے۔

---

[1] امام شافعی ابو عبداللہ محمد بن ادریس عسقلانی مکی (150-204/767-820)

عزیزانِ من! پھر ہوا یہ کہ اس تحریک کے بعد انہیں مرتد قرار دیا گیا اور پھر آپ کی تاریخ بتا رہی ہے کہ بغداد کی گلیوں کی نالیوں ❶ میں کتنا خون بہا۔ فقط اس لیے کہ اس تفسیر میں جو بات آ گئی ہے اس کے خلاف سوچا نہیں جا سکتا' کچھ کہا نہیں جا سکتا' تاریخ میں اس شدت سے واقعہ ہوا اور اس کے بعد جتنی حکومتیں قائم ہوئیں' انہوں نے اسی نظریہ کو اپنے لیے قرینِ مصلحت سمجھا کہ حکومت Popular Will (عوام میں مقبول قوتِ ارادی) کے تابع چلتی ہے۔ یہ جو کہتے ہیں کہ صاحب! ہزار برس میں پھر کسی نے اس کے خلاف کہا ہی نہیں' یہ غلط ہے۔ جنہوں نے آواز اٹھائی تاریخ میں تو ❶ وہ ہے مگر ان کی تصانیف کا ایک ایک ورق ڈھونڈ ڈھونڈ کر جلا دیا گیا' تلف کر دیا گیا۔ ان کا اگر کہیں آپ کو ذکر ملتا ہے یا یہ چیز کہ انہوں نے کیا کہا تھا' اعتراض کے طور پر بعد میں جنہوں نے لکھا' وہ یہ ہے کہ دیکھیے! اس کی تفسیر تو یہ تھی اور یہ فلاں صاحب تھے' وہ اس کے متعلق یہ کہتے تھے۔ وہاں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی ایسے صاحب تھے اور انہوں نے ایسا کہا تھا۔ اور کسی کسی موقعہ پر آپ کو ان کی کوئی چیز اعتراض کے طور پہ ملتی ہے ورنہ اس کے بعد یہی دور رہا۔ یہ ہے وہ چیز جس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ صاحب! پھر اس کے بعد ہزار برس آپ کے ہاں گزر گئے اور کسی نے اس کے متعلق مزید کہا ہی نہیں ہے۔ وجہ یہ تھی کہ کہنے ہی نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اور بات وہی ہے' اس کے لیے دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ تفسیر ہے' اس کے بعد کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کچھ اور کہے۔ یہ بات جی لگتی تھی۔ درمیان میں اتنی سی جو بات تھی' وہی حذف ہوئی ہے کہ ہر بات کے بعد جو اوکما قال تھا 'یا جیسا کہا ہو' تو اس کا کہنے والے کو حق دینا چاہیے تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا ہوگا۔ آپ خود یہ مانتے ہیں 'یہ یا جیسا حضور ﷺ نے فرمایا ہو'۔ یہ اقوال ''منسوب الی الرسول'' ہیں۔ یہ بھی ہمارے ہاں کی اصطلاح ہے کہ حضور ﷺ کی طرف ان چیزوں کی نسبت کی گئی ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا تھا:

اگر نبی اکرم ﷺ اپنی تفسیر کا کوئی ایک مرتب و مدون مجموعہ آپ کو دے جاتے تو بات صاف ہو گئی تھی۔ اس کے بعد جرأت کرنا تو ایک طرف رہا' خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس کا کوئی اور بھی مفہوم ہو سکتا ہے۔ حضور ﷺ نے تفسیر تو ایک طرف رہی' اپنی احادیث کا بھی کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا' صحابہ کبارؓ نے مجموعے مرتب نہیں کیے' انہوں نے تفسیر مرتب نہیں کی۔ یہ اس زمانے میں آ کر یوں ہوا یعنی یہ جتنی چیزیں بھی کی گئی تھیں' اگر ان کے متعلق یہ چیز ہوتی کہ چھان بین کی

---

❶ اس خونِ ناحق بہنے کی چند ایک مثالیں دیکھیے:

(1) امام نفیس شیرستانی آف عریبیہ (461-395ھ) کو سولی پر لٹکا دیا۔ (2) امام الشیخ محمد طاہر المکی (460-417ھ) کو زندہ جلا دیا (3) امام معین الدین العش عربی عراقی (363-313ھ) کو سولی پر لٹکا دیا۔ (4) امام شارق الوی معتزلی فلسطینی (457-407ھ) کو پھانسی دیدی۔ (5) امام عبداللہ زنجانی آف عریبیہ (610-459ھ) کو پھانسی دیدی۔ (6) امام راغب الاصفہانی آف فارس (1409-1327ء) کا سر کاٹ کر تن سے جدا کر دیا (7) امام احمد امین طاہر المصری (1953-1883ء) کو جیل میں تشدد کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

جاسکتی ہے' یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ ان میں سے کونسی ایسی چیز ہے جو ہوسکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہو اور کونسی ایسی ہے جس کے متعلق کہا جائے گا کہ نہیں' یہ حضور ﷺ نے نہیں فرمائی ہوگی' ایسی بات حضور ﷺ نے نہیں کہی ہوگی' یہ آپ ﷺ کی حدیث نہیں ہوسکتی' یہ آپ ﷺ کی تفسیر نہیں ہوسکتی' یہ چیز بھی اگر ہوتی تو پھر بھی بڑی حد تک بات صاف ہوتی چلی جاتی لیکن اس کے بعد یہ حق سلب کرلیا کہ جو کچھ ان کتابوں کے اندر لکھا جاچکا ہے اب اس پہ تنقید نہیں کی جاسکتی۔

علمی اور فکری طور پر ہزار سالہ تاریکی کی وجہ:

میں یہ بیک گراؤنڈ (پس منظر) آپ کو اس لیے دے رہا ہوں کہ آپ کے ذہن میں آجائے کہ پھر ہزار برس میں یہ چیز کیوں نہ ہوئی۔ میں نے دو چیزیں کہی ہیں: (1) شانِ نزول کے مطابق کسی آیت کی تفسیر یا (2) براہِ راست ایسا کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی جب تک میں اس کے متعلق مثال نہ دوں۔ مثال ایک دو نہیں' اس کے متعلق سینکڑوں مثالیں ہیں لیکن ایک مثال سے بات واضح ہوجائے گی کہ حضور ﷺ نے فلاں آیت کی تفسیر میں یہ فرمایا۔ قرآنِ کریم میں یہ ہے کہ اے جماعتِ مومنین! تم اپنے رسول کو اس طرح سے نہ ستانا' یہاں اذیت کا لفظ ہے' جس طرح بنی اسرائیل نے اپنے رسول کو ستایا۔ قرآن کریم کی طرف آیئے تو اس ستانے کی ساری تفصیل قرآن حمید نے خود دی ہے۔ قدم قدم پہ صحرائے سینا کے اندر آ کر وہ دامن پکڑ کر بیٹھ جاتے' قرآن مجید یہاں سے بات شروع کرتا ہے۔ آپ اندازہ لگایئے کہ اتنا بڑا محسن ہے' اتنا بڑا انقلابی پیغامبر ہے' وہ فرعون جیسے جابر کی غلامی سے' ان کو نجات دلا کر آزادی سے یہاں لایا ہے' وہاں کے شرک سے' وہاں کے کفر سے' بھی نجات دلائی ہے' توحید کا سبق بھی دیتا ہے۔

قرآن حمید بتاتا ہے کہ یہ چلے جارہے ہیں' راستے میں دیکھا کہ ایک گاؤں میں کوئی دیوی کی پوجا کر رہے ہیں' بیٹھ گئے کہ موسیٰؑ! ہمیں بھی ایک ایسا بُت بنا دیجیے' او ستیاناس تمہارا! بس چلے جارہے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہاں تمہاری زندگی اس قسم کی سپاہیانہ ہوگی مگر وہ کہتے ہیں کہ نہیں موسیٰؑ! روز ایک ہی قسم کا کھانا کھا کر ہم تو تنگ آگئے ہیں۔ مصر میں کیسے اچھے تھے' ٹھیک ہے بیٹھے ہوئے ان کی ہنڈیا پکایا کرتے تھے لیکن ان کی ہنڈیا میں سے ہم کھایا بھی کرتے تھے' وہاں چٹ پٹے قسم کے کھانے ملتے تھے۔ یہاں لے آیا تو ہمیں مارنے کے لیے! ذرا پانی کی دقت ہو رہی ہے' دہائی مچا دی ہے کہ موسیٰؑ! کیا کر دیا' ہم پھر واپس مصر کو جارہے ہیں۔ موسیٰؑ چار دن کے لیے ان سے دوسری جگہ گئے' پیچھے سے بچھڑے کا ایک بت بنا کر اس کی پرستش شروع کردی۔ آپ دیکھیے قرآن حمید ساری تفصیل دے رہا ہے کہ یہ قوم اپنے اتنے عظیم رسول کو' اتنے بڑے محسن کو' کس طرح ستاتی تھی' کس طرح اذیت دیتی تھی' تنگ کرتی تھی؟ یہ بات کتنی صاف ہے۔

بخاری شریف میں دی گئی ایک آیت کی تفسیر حضرت موسیٰؑ کے غسل کا واقعہ:

بخاری شریف میں اس آیت کی تفسیر میں کہا یہ گیا ہے حضرتِ ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس

آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ بنی اسرائیل حضرتِ موسیٰؑ کو ستاتے تھے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ حضرتِ موسیٰؑ عام طور پر نہانے کے لیے ایسی جگہ چلے جاتے تھے جہاں پردہ ہو' وہ تو میدان میں' صحرا میں' تھے' ندیاں کھلی ہوئی ہوتی ہیں تو وہ لوگ تو اسی طرح سے نہا لیتے ہونگے لیکن بہرحال آپ ستر کی جگہ جایا کرتے تھے' اس کے لیے دور نکل جانا پڑتا ہوگا۔ اب بھی گاؤں کی زندگی میں جب باہر جانا ہوتا ہے تو جانے والے ایسے دور نکل جاتے ہیں جہاں پردہ ہو' جہاں ستر ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حضرتِ موسیٰؑ اس طرح سے نہانے جایا کرتے تھے لیکن قوم میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ ان کے ستر کے مقام کے اوپر کوئی عیب ہے' جس کی وجہ سے یہ سامنے نہیں نہاتے' چھپ کر نہاتے ہیں۔ یہ بات مشہور کرادی۔ یہ بخاری شریف کی حدیث ہے۔ اس الزام کو غلط ثابت کرنے کے لیے خدا کی طرف سے انتظام یہ کیا گیا کہ آپؑ ایک دن اُس ندی میں نہا رہے تھے آپؑ نے کپڑے اتار کر کنارے پہ ایک پتھر پہ رکھے ہوئے تھے' نہانے کے بعد جب آپؑ کپڑے پہننے کے لیے باہر تشریف لائے تو پتھر کپڑوں کو لے کر چل پڑا۔ بخاری شریف کی حدیث ہے' اس میں یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس آیت کی یہ تفسیر فرمائی۔ اب پتھر آگے آگے جا رہا ہے' حضرتِ موسیٰؑ پیچھے پیچھے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ اور پتھر اس طرح سے بھاگتا بھاگتا بنی اسرائیل کے اس کیمپ میں آ گیا اور اس کے پیچھے حضرتِ موسیٰؑ اسی طرح سے آ گئے تو انہوں نے جب دیکھا تو کہا کہ نہیں' او! وہ تو کسی نے یونہی بات پھیلائی تھی' یہ تو اچھا بھلا ہے' پھر آپؑ نے وہ کپڑے لیے' پہنے' اور اس پتھر کو پانچ سات دفعہ مارا۔ حضرتِ ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اس پتھر پہ نشان پڑ گئے ہوئے ہیں۔ یہ اس آیت کی تفسیر آئی ہے جسے کہا گیا ہے کہ حضورِ نبی اکرم ﷺ نے اس کی یہ تفسیر فرمائی تھی۔

اب آپ غور کیجیے کہ جب عقیدہ یہ پیدا کر دیا جائے کہ یہ حضور ﷺ کی ارشاد فرمودہ تفسیر ہے' اس کے بعد کس کی جرأت ہے کہ اس کے اوپر ذرا سی تنقید تو ایک طرف' وہ تو آپ خاموش بیٹھے ہیں' نہیں کر رہے' یہ جو آپ کے ہونٹوں پہ ہنسی تیر گئی ہے' اس کی بھی اجازت نہیں دی جا سکتی ہے۔ جب یہ عقیدہ مان لیا جائے کہ یہ تفسیر رسول اللہ ﷺ کی فرمائی ہوئی ہے' تو آپ نے غور فرمایا کہ پھر یہ ہزار برس میں اس آیت کی یہی تفسیر' آج تک کیوں ہوتی گئی۔ اذیت کا مفہوم یہ ہوا۔ یہ میں نے آپ کو ایک مثال دی ہے۔ یہ جو آپ کے ہاں کی کتبِ تفاسیر ہیں انہوں نے ان کے ترجمے بھی کر دیئے ہیں' انہیں آپ اٹھا کر دیکھیے۔ بخاری شریف کے بھی ترجمے ہو گئے ہوئے ہیں' اس میں بھی آپ دیکھیے کتنا کچھ آپ کو اس قسم کا ملتا ہے۔

شانِ نزول کے پیشِ نظر ایک آیت کی تفسیر:

دوسری چیز میں نے شانِ نزول کی کہی کہ شانِ نزول کے اعتبار سے آیت نازل ہوا کرتی تھی لہٰذا اس آیت کے جو الفاظ ہیں' جو ان کے معنی اس واقعہ کی رو سے متعین کیے جائیں گے' اس کی ایک مثال یہ عرض کیے دیتا ہوں۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ﴿٢٤﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ

عَلِيۡمٌ ﴿۲۵﴾ (15:24-25) ہم انہیں بھی جانتے ہیں جو پہلے گزر گئے ہوئے ہیں' ہم انہیں بھی جانتے ہیں جو مستاخرین ہیں' پیچھے رہ جانے والے ہیں' اگلے جو چلے گئے انہیں بھی جانتے ہیں' آنے والوں کو بھی جانتے ہیں اور ان سب کو ایک دن جمع کرنے والے ہیں اور اِنَّهٗ حَكِيۡمٌ عَلِيۡمٌ (15:24) علیم خود بتا رہا ہے کہ قرآن کریم کیا بات کہہ رہا ہے۔قرآن حمید کی یہ آیت ہے۔میں نے جیسا عرض کیا ہے کہ قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنی ایک آیت کی' ایک حکم کی' تشریح اور تفسیر دوسرے مقامات پر خود کرتا چلا جاتا ہے۔دوسرے مقام پہ ہے کہ: قُلۡ اِنَّ الۡاَوَّلِيۡنَ وَالۡاٰخِرِيۡنَ ﴿۴۹﴾ لَمَجۡمُوۡعُوۡنَ ۙ اِلٰى مِيۡقَاتِ يَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ ﴿۵۰﴾ (54:49-50)۔آپ دیکھیے گا کہ قرآن دو الفاظ مرادف لے آیا' وہاں مُسۡتَقۡدِمِيۡنَ اور مُسۡتَاۡخِرِيۡنَ (15:24) تھا' یہاں اَوَّلِيۡنَ اور اٰخِرِيۡنَ (56:50) لے آیا: پہلے گزرے ہوئے بھی' اور بعد میں آنے والے بھی' مرادف دے کر اس نے معنی متعین کر دیئے۔اس آیت کی تفسیر میں' جامع ترمذی ❶ میں' حضرتِ ابنِ عباس ؓ کی روایت کے مطابق یہ لکھا ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ مسجدِ نبوی میں' میں اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے تحریماً معذرت چاہتا ہوں کہ یہ چیزیں تشریحاً مجھے کہنی پڑتی ہیں' یہ حدیث ہے جو بیان کر رہا ہوں' حضور ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے ایک بڑی حسین عورت صف میں آ کر کھڑی ہوتی تھی' عورتوں کی صف پیچھے ہوتی تھی مردوں کی آگے ہوتی تھی' تو ان میں سے صحابہؓ ہیں جو مسجدِ نبوی میں رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔بہرحال مسجد نبوی کے نمازی تو ہیں۔تو ان میں سے کچھ لوگ جو نیتوں کے نیک تھے' وہ تو آگے چلے جاتے تھے اور کچھ لوگ مردوں کی آخری پچھلی صف میں کھڑے ہو جاتے تھے اور جب رکوع میں جاتے تھے تو اپنی بغل کے نیچ سے اس عورت کو جھانکا کرتے تھے۔اس پر خدا نے یہ آیت نازل کی کہ ''چور دیو پترو!'' (اے چور کے بچو!) ہم جانتے ہیں جو تم میں سے آگے جا کر کھڑے ہوتے ہیں اور انہیں بھی جانتے ہیں جو پچھلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔

عزیزانِ من! ہنسئے نہیں' خون کے آنسو بہایئے۔اس آیت کی یہ شانِ نزول ہے۔اب اس شانِ نزول کے بعد مستقبلین اور مستاخرین کے معنی پھر آپ نے متعین کر لیے: اگلی صف میں جا کر کھڑے ہونے والے اور پچھلی صف میں کھڑے ہونے والے' پھر ان کے مرادف بھی عربی زبان میں آ گئے۔سیدھی سی بات ہے کہ قرآن تو ان مرادفات کو صحیح سمجھتا ہے جس میں اولین اور آخرین کہا تھا۔اس شانِ نزول کی رو سے یہ تفسیر بھی ہو گئی کہ انہوں نے ان چیزوں کو دیکھا' بات کی۔ امام احمد بن حنبلؒ (164-241H/780-855A.D) نے یہ اپنے ہاں لکھا ہے کہ احادیث کی کتابوں میں تین چیزیں قابلِ اعتماد نہیں ہیں: ملاحم' مغازی اور تفسیر یعنی پیشن گوئیوں کے متعلق جو روایتیں آئی ہیں' جنگوں کے متعلق جو آئی ہیں وہ' اور تفسیر کے متعلق جو روایتیں آئی ہیں وہ' لیکن ان چیزوں کو کوئی نہیں سنتا ہے۔امام احمد بن حنبلؒ کی نسبت معتزلہ سے نہیں ہے۔

---

❶ ترمذی۔آپ امام ابوعیسیٰ ترمذی (209-279/290ھ) ہیں۔آپ ایران کے شہر ترمذ کے رہنے والے تھے۔آپ کے مجموعہ احادیث کا نام جامع ترمذی ہے۔

ان کا تو اپنا احادیث کا ایک مجموعہ ہے' وہ ان سب سے بڑا ہے اور پھر ہمارے ہاں کے فقہ کے جو آئمہِ اربعہ [2] ہیں ان میں سے یہ بھی ایک امام ہیں۔ ان کا یہ قول ہے۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ ان کے باوجود یہ ساری چیزیں آپ کے کتبِ احادیث میں ہیں' تاریخ میں ہیں' ان کی بنا پر طبری کی تفسیر میں ہیں۔ تفسیر میں لکھا یہ ہے کہ قرآن حمید کی اس آیت کی تفسیر رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمائی یا اس کا شانِ نزول یہ تھا۔ اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ جب کوئی چیز عدالت کے اندر بھی متنازع فیہ ہو جائے تو اس میں Case Law کو دیکھا جاتا ہے' Circumstancial Evidence (واقعاتی شہادت) کو دیکھا جاتا ہے یعنی جو واقعہ ہوتا ہے' اس سے مقدمے کی بات چلتی ہے کہ صاحب! ہوا کیا تھا۔ وہ کہتا ہے اس نے مجھے گالی دی تھی۔ وہ یہ بات پوچھتا ہے کہ صاحب! بات کہیے کہ ہوا کیا تھا۔ اس ''ہوا کیا'' کے اوپر اس چیز کا یہ فیصلہ ہو جاتا ہے۔ ''یہ ہوا کیا تھا'' اس کو کہتے ہیں ان آیات کا شانِ نزول۔ اب جو شانِ نزول بھی متعین کر کے دیدیئے جائیں اور جہاں شانِ نزول کی یہ بات نہ ہو' جیسے حضرتِ موسیٰؑ کے متعلق وہ آیت آئی' اس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر کے ایک تفسیر آ جائے' پھر کون اس کے بعد یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ یہ ایسا نہیں ہے۔

کسی حدیث کے صحیح ہونے کا معیار صرف قرآنِ حکیم کی راہنمائی ہے:

سمجھانے کی بات صرف اتنی سی تھی کہ یہ تفسیر اور حدیث رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہے' یہ حضور ﷺ کی طرف منسوب کی گئی باتیں ہیں' ان میں صحیح بھی ہو سکتی ہیں' غلط بھی ہو سکتی ہیں۔ جہاں تک قرآن کریم کی تفسیر کا تعلق ہے اس کے لیے ہمارے سامنے بالکل واضح معیار ہے۔ وہ یہ کہ ان میں سے کوئی چیز جو قرآن کی تعلیم' اس کی روح' اس کے حکم کے' خلاف جائے' ہم کہیں گے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایسا نہیں فرمایا ہوگا' یہ حضور ﷺ کی حدیث نہیں ہو سکتی' جو اس کے مطابق ہے' آپ کہیے گا کہ سر آنکھوں کے اوپر یہ حضور ﷺ کی حدیث ہو سکتی ہے۔ جو شخص ایسے مقام پہ کہتا ہے کہ میں اس حدیث سے انکار کرتا ہوں' یہ اس کے خلاف پروپیگنڈہ ہے۔ یہ کہنا کہ یہ احادیث کا انکار کرتا ہے' غلط ہے۔ وہ انکار یہ کرتا ہے کہ یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہو سکتی' وہ حضور ﷺ کی حدیث کا انکار نہیں کرتا' اس خاص حدیث کی جو نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف جاتی ہے' یہ اس سے انکار کرتا ہے۔ انکار کی بنیاد یہ ہے کہ یہ قرآن کریم کے خلاف جاتی ہے' اس سے حضور ﷺ کی سیرت پر طعن پڑتا ہے' اس سے صحابہ کبارؓ کی سیرت پر اعتراض اٹھتا ہے' اس لیے یہ رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہو سکتی۔ یہ حدیث کہ قیامت میں نبی اکرم ﷺ یہ دیکھیں گے کہ ایک گروہ ہے' جس کو فرشتے جہنم کی طرف لیے جا رہے

آئمہ اربعہ میں یہ امام آتے ہیں: (1) امام اعظمؒ کوفی' امام ابوحنیفہؒ کوفی (150-80ھ)، (2) امام مالکؒ یمنی' مدنی (179-93ھ)، (3) امام شافعیؒ عسقلانی' مکی (204-150ھ) اور (4) امام احمد بن حنبلؒ بغدادی (241-164ھ)۔ انہیں آئمہ فقہا بھی کہتے ہیں۔ چونکہ کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں تھی' مختلف فقہا نے اپنے اپنے طور پر قوانین مرتب کر لیے اور ان کے معتقدین نے ان قوانین کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے لیا۔ اس طرح یہ امت فرقوں میں بٹ گئی۔ ان ائمہ فقہا کی تعداد تو بہت زیادہ تھی لیکن ان میں سے انہی چار نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اہل تشیع کی فقہ جعفری ان سے الگ ہے (ادارہ طلوعِ اسلام: فقہی قوانین کی دینی حیثیت (پمفلٹ)' لاہور' ص۔ 9)۔ نیز رشید احمد یعقوب: اللہ' رحمۃ اللعالمین ریسرچ سنٹر' کراچی' 2009' ص۔ 86۔

ہیں اور آپ ﷺ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو میرے صحابہ ہیں' ان کو جہنم کی طرف کیوں لیے جا رہے ہو تو خدا کی طرف سے آواز آئے گی کہ جب تک تُو ان میں تھا تو یہ ٹھیک ایمان پہ رہے تھے۔ تمہارے جانے کے بعد یہ مرتد ہو گئے تھے (معاذ اللہ)۔ یہ بخاری شریف کی حدیث ہے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ کوئی ایسی حدیث جو قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف جائے' کوئی ایسی حدیث جس میں کسی نبی یا خود رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس پہ کوئی طعن پڑتا ہو' کوئی ایسی حدیث جس سے صحابہ کبارؓ کی سیرت پر طعن پڑتا ہو' جو مشاہدات کے خلاف ہو' جو علمی تحقیق کے خلاف ہو' فکر و تدبر کے خلاف ہو۔ عزیزانِ من! اس کے متعلق یہ کہہ دینے سے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہو سکتی نہ زمین پھٹ جائے گی' نہ آسمان گر جائے گا۔

مستشرقین کی طرف سے پیش کردہ مخالف لٹریچر' ہماری طرف سے پیش کردہ خلافِ قرآن روایات کی بنیاد پر مبنی ہے۔ نیز شانِ نزول کی ایک اور مثال

اگر یہ معیار کسی وقت مقرر کر لیا جاتا تو یہ دشواریاں' جو آج آپ کو اس طرح پیش آ رہی ہیں' پیش ہی نہ آتیں اور نہ ہی آپ کے ہاں مستشرق نبی اکرم ﷺ' صحابہ کبارؓ اور قرآن کریم کے خلاف کچھ لکھتے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ جو وہاں کے مستشرق ہیں' وہ نبی اکرم ﷺ' صحابۂ کبارؓ اور قرآن کریم کے خلاف جو کچھ لکھتے چلے جا رہے ہیں' وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھتے۔ آپ کی ان کتابوں کے اندر وہ سب موجود ہوتا ہے جو وہ لکھتے ہیں۔ آپ کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے ہاں کی کوئی کتاب آئے' جس میں یہ کچھ ان کتب میں سے لکھا ہوا ہو تو دہائی مچا دی جاتی ہے کہ صاحب! اس کو Ban (ممنوع) کر دیجیے' اس کو Proscribe (خلافِ قانون) کر دیجیے' اس کو جلا دیجیے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ جن کتابوں سے' جن سر چشموں سے' پانی کا یہ کوزہ لے کر گئے ہیں ارے' ان کو بند کیجیے یا ان پر کسی طرح سے تنقید کیجیے۔ وہ تو بدستور بہے چلا جا رہا ہے' بدستور نہیں بلکہ اس کے لیے ان کو پھیلانے میں' طبع کرانے میں' نشر و اشاعت میں' تو اتنی کوششیں ہوتی ہیں' جہاد ہوتے ہیں۔ اگر وہ مستشرق ان میں سے دو چار باتیں اپنی کتاب میں لکھ دیتا ہے تو دہائی مچا دی جاتی ہے۔

عزیزانِ من! ایک دفعہ میرے پاس بھی ایک ایسی کتاب آئی تھی۔ وہ ولایت کے ایک مستشرق کی' سیرتِ نبوی ﷺ کے متعلق لکھی ہوئی تھی۔ اُس میں ایسی دل آزاری کرنے والی چیزیں تھیں۔ مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ تمہارا کیا خیال ہے' کیا اس کتاب کو Ban (ممنوع) کرنا چاہیے؟ میں نے اس پر انہیں لکھ کر بھیجا تھا کہ یقیناً اس کو Ban (ممنوع) کرنا چاہیے' اس میں اس قسم کا مواد ہے لیکن Ban (ممنوع) کرتے وقت آپ یہ لکھا کرتے ہیں کہ یہ کتاب بھی Ban (ممنوع) کی جاتی ہے' اسی کتاب میں جو جو لکھا ہے اگر کسی دوسری کتاب میں اس کا کوئی اقتباس ہوگا تو وہ بھی Ban (ممنوع) ہوگی' اس کا ترجمہ کہیں کیا ہوگا' تو وہ بھی Ban (ممنوع) ہوگا۔ اس کو آگے اس طرح سے Quote (نقل) کرنا' اس کا اقتباس کرنا'

وہ بھی جرم ہوگا۔ آگے میں نے کہا اور لکھا کہ جب یہ بھی آپ ساتھ لکھتے ہیں تو آپ کی اطلاع کے لیے گزارش کردوں کہ میں نے اس کتاب کے ایک ایک اقتباس کو لے کر اس کے مقابلے میں بخاری شریف کی ایک ایک حدیث نقل کردی ہے کہ یہ اس کا ترجمہ ہے تو جب آپ نوٹیفکیشن جاری کریں تو اس میں مبہم رکھنے کی بجائے یہ کہہ دیجیے گا کہ یہ بھی Ban (ممنوع) کی جاتی ہے اور جس کتاب سے یہ مواد لیا گیا ہے' اسے بھی Ban (ممنوع) کیا جاتا ہے ''ہن تیکر مڑ کے نئیں گل آئی ایدھر'' (وہ بات اب تک مڑ کر ادھر نہیں آئی)۔ بات آئی تو یہ آئی کہ اس کو پھانسی پہ لٹکا دو' یہ منکرِ حدیث ہے۔

عزیزانِ من! یہ بیک گراؤنڈ' یہ پسِ منظر اور اس کی وضاحت نہایت ضروری تھی کہ معنی کیسے متعین ہوتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے کہا ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (4:34)۔ اس آیت کی شانِ نزول یہ ہے جو ایک حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ معنی کیسے متعین ہوتے ہیں۔ احادیث میں یہ چیزیں موجود ہیں جو میں عرض کر رہا ہوں' تفاسیر میں یہ چیزیں موجود ہیں جو میں عرض کر رہا ہوں' طبری میں یہ موجود ہیں' طبری پر موجود جو آگے تفاسیر چلتی ہیں' ان میں موجود ہیں۔ شانِ نزول یہ لکھ دیا گیا ہے کہ ایک عورت نے نبی اکرم ﷺ سے آ کر شکایت کی کہ اس کا خاوند اس کو مارتا ہے۔ آپ ﷺ نے اسے حکم دیا کہ اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا' تم اس کا بدلہ لے سکتی ہو۔ جونہی آپ ﷺ نے یہ فرمایا تو آیت نازل ہوگئی کہ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (4:34) تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آپ نے دیکھا کہ معنی کیسے متعین ہوتے ہیں۔ اس کی شانِ نزول دوسری جگہ لکھی ہے۔

''عورتوں کا مردوں اور مردوں کا عورتوں کو مارنا'' کیا یہ حدیثِ نبوی ﷺ ہو سکتی ہے؟

اور کیا مرد عورتوں پر داروغہ یا ان کا کفیل ہے؟

شانِ نزول میں بھی کئی کئی روایتیں ہوتی ہیں۔ اس میں یہ لکھا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے خود ہی مردوں سے یہ کہا کہ عورتوں کو مارا نہ کرو' یہ نہایت بری بات ہے۔ اس کے بعد حضرتِ عمرؓ (581-644/45ء) حضور ﷺ کے پاس آئے۔ معاف رکھیے گا اگر میں یہ عرض کروں کہ حضرتِ عمرؓ کی کچھ ایسی سیرت بتائی ہوئی ہے کہ عام طور پر رسول اللہ ﷺ کوئی حکم دیتے ہیں' کچھ ایسا کرتے ہیں تو وہ ہاتھ میں اپنا کوڑا لیے ہوئے جھٹ آ جاتے ہیں کہ آپؐ نے یہ کیا کہہ دیا تھا (معاذ اللہ معاذ اللہ)۔ کیا کچھ میں عرض کروں کہ کیا کچھ نہیں ہے۔ ہاں تو روایت میں یہ ہے کہ حضرتِ عمرؓ ' آپ ﷺ کے پاس آئے اور آ کر کہا کہ آپ ﷺ نے عورتوں کو یہ کیا کہہ دیا' وہ مردوں پر دلیر ہوگئی ہیں۔ اس قسم کے ''حضرتِ عمرؓ'' میرے پاس بھی آیا کرتے ہیں کہ صاحب! تم نے اپنے درس میں یہ کیا کہا کہ عورت واجب الاحترام ہے' مساوات کا حق رکھتی ہے' اس کے بڑے حقوق ہیں' ان کو ہمارے مقابل میں بڑا دلیر بنا دیا ہے۔ بہر حال حدیث میں ہے کہ حضرتِ عمرؓ آئے اور آپؐ

نے حضور ﷺ سے کہا کہ آپ ﷺ نے یہ کیا کیا' عورتیں بہت دلیر ہوگئی ہیں' آپ ﷺ نے مردوں کو پھر کہہ دیا کہ نہیں بھئی ! انہیں مارا کرو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کیسے احکام دے رہے ہیں کہ مارا کرو۔ اور مردوں کی طرف سے دھڑا دھڑ مار شروع ہوگئی تب عورتیں آئیں اور کہا کہ انہوں نے تو پہلے سے بھی زیادہ انتقام لینا شروع کر دیا ہے' آپ ﷺ نے پھر عورتوں سے کہا کہ نہیں ! جاؤ پھر تم بھی بدلہ لو۔ اس پہ یہ آیت نازل ہوگئی کہ نہیں ! اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34)۔ یہ ساری وضعی چیزیں یونہی قائم رکھنے کے لیے ان میں سے کسی کو بعد میں یہ خیال آیا ہوگا۔

بنوعباس کے دورِ ملوکیت میں عورتوں کی حالتِ زار' لونڈیوں کی نیلامی اور خلیفہ ہارون رشید کا ذکر:

اب آپ سوچ سکتے ہیں کہ تیسری صدی ہجری وہ ہے جس میں آپ کے ہاں ملوکیت کی شدت ہے' بنوعباس کا زمانہ (132-656/750-1258A.D ھ) ہے اور اس دور کے اندر عورتیں تھیں' یہ تو بیچاری الگ رہیں' عوام کے ساتھ جو کچھ ہوتا تھا' پوچھو تاریخ سے کہ استبدادِ ملوکیت کے اندر عورت کی پوزیشن کیا تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ جہاں حکومت کے ڈیپارٹمنٹ (اداروں) تھے' ان میں ایک معتبر ترین ڈیپارٹمنٹ لونڈیوں کی خرید و فروخت کا تھا۔ بغداد کے اندر' جو سب سے زیادہ بستی ہوئی مارکیٹ تھی' وہ لونڈیوں کی خرید و فروخت کی تھی۔ جس میں شام کو لونڈیاں نیلام ہوا کرتی تھیں اور کیفیت یہ تھی۔ ہارون رشید کے دور (170-193H/786-809A.D) کا Heroes of Islam (مشاہیرِ اسلام) کے سلسلہ میں نام لیا جاتا ہے۔ اس نام کے سامنے آنے پر ذہن میں یہ آتا ہے کہ صاحب! کیا بات تھی' ہمارے ہاں کے ان خلفاء کی' سلاطین کی' کہ تین ہزار لونڈیاں تو ان ہارون یا مامون کے حرم میں بھی موجود تھیں۔

دورِ ملوکیت میں لکھی گئی یہ تفسیریں اور یہ تاریخ جو گزشتہ ہزار برس سے پیش کی جارہی ہیں:

''رسولِ خدا نے کچھ اور چاہا تھا اور خدا نے کچھ اور''

اِس دور میں آپ کے ہاں یہ تاریخ لکھی گئی' اس دور میں یہ تفسیر لکھی گئی اور اس دور میں یہ روایات لکھی گئیں۔ ہاں تو بات عورتوں کی پٹائی کی ہو رہی تھی۔ پھر کسی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ جو صاحب! عورتوں کو دھڑا دھڑ مار شروع ہو جاتی ہے' وہ عورتیں بیچاری آپ ﷺ کے پاس شکایت لے کر آتی ہیں اور اس کے بعد یہ کہا جاتا ہے کہ نہیں' تم بدلہ نہیں لے سکتیں۔ تو یہ چیز ذہن میں آتی ہے کہ یہ بڑی زیادتی اور ظلم ہے۔ یہ ذہن میں آیا تو آپ دیکھیے کہ اب اس بات کی تلافی کیسے ہو رہی ہے۔ وہ یوں ہو رہی ہے' کہ یوں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ارضنا امرًا و اراد الله غیرہ کہ بھئی! ہم نے تو کچھ اور بات سوچی تھی' اب میں کیا کروں' خدا نے اس کے خلاف حکم دیدیا ہے۔ تم بھی ماتھا پیٹو' میں بھی پیٹتا ہوں (یا اللہ یا اللہ!)

اے محمدؐ گر قیامت را براری سر زخاک!
سر بر آرد ایں قیامت درمیان خلق بیں!

ہزار برس سے تیری امت ان چیزوں کو سینے سے لگائے ہوئے' انہیں تیری طرف منسوب کیے چلی جارہی ہے۔ اِسے قطعاً احساس نہیں ہے کہ ایک دن تیرے ﷺ سامنے بھی جانا ہے' خدا کے سامنے بھی جانا ہے۔ کہہ رہے ہیں کہ میں کیا کروں' مجھے قابلِ اعتراض کیوں مانتے ہو' میں نے تو کچھ اور چاہا تھا' خدا نے کچھ اور کر دیا۔ اُس نے کہہ دیا ہے کہ یہ عورتوں کے اوپر حاکم ہیں۔

عزیزانِ من! اس شانِ نزول کے بعد تفسیر طبری کے اندر یہ بات آئی کہ مرد حاکم ہیں' داروغے ہیں' ان کو حق حاصل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جو اس طرح سے مار پیٹ کا حق ہے یہ تو جیل خانے کے داروغے کو بھی نہیں ہوتا۔ وہ بھی چھپ چھپا کر یہ کچھ کرتا ہوگا۔ یہ تو ہوئے الطبری اور اس کی تفسیر۔ اب اس کے بعد آپ کے ہاں شریعت کا حکم آ گیا کہ یہ مرد حاکم اور داروغے ہیں' یہ مار پیٹ سکتے ہیں' اس کی فریاد کہیں بھی نہیں کی جا سکتی' شریعت کا حکم ابدی ہے' غیر متبدل ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہے جو اس کی تفسیر میں آیا ہے۔

دینی سوچ سے پہلے پرویز صاحبؒ کے مذہبی دور کی کہانی اُن کی اپنی زبانی:

اب آگے چلیے مجھ سے کہا جاتا ہے کہ تم جو یہ چیز بیان کر رہے ہو' یہ کس طرح سے بیان ہو رہی ہے۔ میں نے گزارش کی ہے کہ پہلی چیز تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس توفیق پہ میں جتنا بھی سجدۂ شکرانہ بجالاؤں' کم ہے کہ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ قرآن کریم کی آیات کا مفہوم قرآن کریم کے اندر سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ یہ پہلی بات تھی جو علامہ اقبالؒ (1877-1938ء) نے میرے کان میں پہلی دفعہ ڈالی۔ میں متشدد قسم کا مُلّا تھا۔ یہ جتنی احادیث اور تفاسیر ہیں اور یہ ساری تاریخ ہے' انہیں میں اسی طرح سے پڑھا کرتا تھا' ان پہ اسی طرح سے عقیدہ بھی رکھتا تھا۔ جب مجھ میں شکوک اور اعتراضات کا دور شروع ہوا ہے تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکلی۔ علامہ اقبالؒ کا بہت بڑا احسان تھا جس نے یہ کہا کہ ان چیزوں کو چھوڑ دو۔ میں یہ بھی تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ کہاں سے آئیں اور پھر یہ بھی بتاتا ہوں کہ کشتی کا لنگر صرف قرآنِ کریم ہے' قرآن کریم کے سمجھنے کا طریقہ (1) تصریفِ آیات اور (2) محاورۂ عرب ہے۔ میری دعا ہے کہ علامہ اقبالؒ کی لحد پر آسماں شبنم افشانی کرے۔

عزیزانِ من! میں اپنے متعلق یہ عرض کر رہا ہوں کہ مجھ پہ جو علامہ اقبالؒ کا احسان ہے' اس میں دو چیزیں ہیں۔ اب یہ چیزیں آئیں کہاں سے؟ اس کے لیے انہوں نے تاریخ میں میری راہنمائی کی' پھر دس سال کا میرا وہ دور جس میں' میں نے ایک ایک چیز کو جو اسلام کے اندر آئی ہوئی ہے' اس کا اصلی سرچشمہ' ان تاریخوں سے' اور ان چیزوں سے' خود نکالا۔ تصریفِ آیات کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن کریم نے ایک جگہ جو کہا ہے' سارے قرآن کریم میں دیکھو کہ اس کے متعلق کیا کچھ کہا گیا ہے۔ میں نے قرآن کریم کو اس طرح سے پڑھنا شروع کیا۔ اللہ کا احسان ہے' یوں سمجھ لیجیے کہ چالیس سال ہو گئے ہیں کہ میں نے اس انداز سے قرآن کریم پہ غور کیا ہے۔ اور اگلی چیز محاورۂ عرب تھی یعنی یہ دیکھو کہ اس دور میں جو زبانِ عربی تھی' اس میں ان الفاظ کے معنی کیا تھے۔ یہ بڑی اہم چیز ہے اس لیے کہ خدا نے کہا ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو عربیٔ مبین میں نازل کیا ہے تو وہ بڑی ضروری چیز ہے کہ وہ بھی دیکھی جاتی۔ اب وہ کیسے دیکھی جائے؟ یہ سب کچھ میں نے اس دوران میں کیا تھا۔

عزیزانِ من! یہ جو محاورۂ عرب والی بات تھی' یہ آگے ہے۔ اس سے پیشتر یہ چیزیں مجھے کہیں کہی ہوئی نہیں ملی تھیں' بہت

تلاش کیا' جب نہیں ملیں تو قرآن کریم کی وہ تصریف کی چیز بھی میں نے خود کی۔ یہ وہ تبویب ہے جو میرے ہاں رجسٹروں کے رجسٹر لکھے ہوئے ہیں۔ میں یہ عرض کروں کہ اب آخری چیز' میں اس وقت آخری کہہ رہا ہوں' پتہ نہیں اللہ اور توفیق دے گا تو قرآن کریم کے متعلق کیا کرونگا' اس وقت مجھے چار پانچ برس ہو گئے ہیں' جسے 'تبویبِ قرآن' کہتے ہیں یعنی قرآن کریم کو Classify کرنا' میں وہ کر رہا ہوں' اس میں لگا ہوا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اگر کوئی ایک موضوع آپ کے ذہن میں آئے تو سارے قرآن کریم کی تعلیم اس کے نیچے آپ کو مربوط شکل میں مل جائے۔ اسے تصریفِ آیات کہتے ہیں۔

اگلی چیز تھی جسے میں نے محاورۂ عرب کہا ہے کہ عربوں کے ہاں ان الفاظ کے معنی کیا تھے۔ یہ چیز غنیمت ہے کہ ہمارے پاس کچھ تو جاہلیتِ عرب کے زمانے کے شعرا کا کلام موجود ہے۔ اس زمانے میں کتاب تو کوئی لکھی ہوئی ہوتی نہیں تھی' عربی زبان میں قرآنِ کریم سب سے پہلی کتاب ہے' اس سے پہلے کوئی کتاب ان کے ہاں نہیں تھی۔ ان کے ہاں شعراء کا جو کلام تھا' وہ عربی زبان کے اندر متداول چلتا تھا' وہ آگے منتقل ہو کر آیا اور شعر میں یہی بات ہے کہ وہ آگے سے آگے منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ نثر میں بھی تحریف ہو جاتی ہے اور بہت سے لوگ خود الفاظ بنا کر کسی کی طرف منسوب کرتے ہیں' لیکن شعر جو منتقل ہو کر آتا ہے وہ بالفاظہٖ منتقل ہو کر آتا ہے' وہ لفظوں میں منتقل ہو کر آتا ہے۔ ایک تو ہمارے ہاں یہ چیز بڑی Advantageous (سودمند) رہی کہ وہ جو قبل از اسلام کی عربی زبان کے شعرا کے کلام کا ایک ذخیرہ تھا' وہ منتقل ہو کر آگے آیا اور اس کے بعد جو ان کی بنیادوں پر ہمارے ہاں لغت مرتب ہوئے' ان میں سے ہر ایک نے تو نہیں البتہ جو زیادہ مبسوط لغت تھے' اس میں یہ کیا کہ زمانۂ جاہلیت کے اندر کی جو چیزیں ان کو سند میں ملیں' ان کے اعتبار سے بھی ان الفاظ کے معنی اس میں دے دیئے اور یہ بھی لکھا کہ تفسیر میں اس کے متعلق یہ آیا ہے' روایت میں اس کے متعلق یہ آیا ہے۔ پھر جب میں نے دیکھا کہ قرآن کریم کا ایک ایسا لغت ہونا چاہیے جس میں یہ جو چیزیں ہیں' جن کو آپ تفسیر میں' یا روایت میں' تاریخ میں' شانِ نزول میں' جو کچھ آیا ہے' یہ تو اس کے اندر نہ ہو' لیکن اس میں یہ ہو کہ زمانۂ نزولِ قرآن کریم میں ان الفاظ کے معنی وہ عرب کیا لیتے تھے اور قرآنِ کریم میں اس کی وضاحت کس طرح کی گئی ہے۔ اس لیے تصریفِ آیات اور محاورۂ عرب کی بنیادوں کے اوپر ایک لغت ہونا چاہیے۔

(Lane) لین کے عربی لغت لکھنے کی جدوجہد بھری داستان:

عزیزانِ من! میں اس کی بارگاہ میں پھر سرِ نیاز جھکاتا ہوں کہ یہ لغت مرتب کرنا کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں ہے لیکن میں نے وہ لغات القرآن مرتب کیا۔ ذرا سنیے! ایڈورڈ ولیم لین (Edward William Lane) نے جب اپنا An Arabic-English Lexicon (عربی۔ انگریزی لغت) لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ میرے پاس فنڈز نہیں ہیں' لارڈ پرڈھو (Lord Pardhoe) جس کا نام الجرنان (Algernon) تھا' وہ وہاں کا ایک نواب تھا'

اس نے اپنی ریاست اس کو دیدی۔ یہ کس لیے دی؟ انگریزی میں عربی کے لغت لکھنے کے لیے۔ یہ تو فنانسز تھے وہ گروہِ ایڈورڈ ولیم لین مصر میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہ کم ازکم چالیس پچاس اسکالرز (علما) کا ایک گروہ تھا' اسے تیس سال سے زیادہ عرصہ لگا۔ زمانے کی بدقسمتی دیکھیے کہ وہ حرفِ 'ک' تک پہنچا تھا کہ اس کی Death (موت) [1] ہوگئی۔ وہ لوگ تو ایک طرف رہے' اِدھر ہم میں سے بھی کسی کو توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ انہی لائنز کے اوپر' اس کا باقی حصہ بھی مکمل کر دیا جائے' باقی حصے کے متعلق وہ جونوٹ (شذرات) چھوڑ گیا تھا' صرف وہی ہیں جو ایک جگہ دیئے [2] ہوئے ہیں۔

میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ان میں سے وہ لوگ جن کو علم کے ساتھ دلچسپی یا شوق یا جنون ہوتا ہے' وہ کیا کرتے ہیں؟ اب یہ لغت لکھا تو اس کو چھپوانے کے لیے اس نے یہ انتظام کیا کہ کوئی اور چھاپہ خانہ اس طرح سے نہیں چھاپ سکتا' اس کے لیے اس کا جو بھتیجا [3] تھا' یہ وہی ہے جو (Poole) پول Historian (مورخ) ہے۔ یہ اس کا بھتیجا تھا۔ اگر کسی نے پول کی History (تاریخ) پڑھی ہے تو وہ جانتا ہے کہ یہ شخص کتنا بڑا اسکالر (عالم) ہے۔ اُس نے اپنے اس بھتیجے کے ذمہ صرف یہ کام لگایا کہ اس لغت کو چھاپنے کے لیے جو ٹائپ ہے وہ مرتب کرو۔ اس نے اپنی نگرانی میں اس سے وہ ٹائپ مرتب کرایا' ایک چھاپہ خانہ بنایا' اس میں بہرحال یہ کام سرانجام دیا۔

لغت کی تیاری کے سلسلہ میں علامہ پرویزؒ کی بے سروسامانی کا عالم' اس لغت کی افادیت اور نوعیت:

میں کہہ رہا ہوں کہ لغت کا لکھنا کیا ہوتا ہے؟ سنیے! عزیزانِ من! یہ ایک فقیرِ بےنوا [4] دفتر کا ایک کلرک تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ یہ لغت ہونا چاہیے۔ سارے ہندوستان میں قبل از تقسیم بھی یہ چیز رہی کہ میں نے ایک ایک سے یہ کہا کہ ایسا لغت تیار کرنے کی ضرورت ہے' کسی نے بھی ہمت نہ کی۔ میں بطورِ تحدیثِ نعمت یہ عرض کر رہا ہوں' کسی فخر کی بنا پہ نہیں کہ پھر آپ کو معلوم ہے کہ میں نے یہ لغت مرتب کیا' عربی زبان کی جتنی مستند کتب ہیں ان کے حوالے سے' ایک ایک لفظِ قرآن کریم کے وہ معنی متعین کر کے اس میں دیئے جو انہوں نے اس زمانے کی عربی زبان کی رو سے کیے تھے' جو نزولِ قرآن کریم کے زمانے میں رائج تھی' اور ہر لفظ کے متعلق پھر یہ بتایا کہ قرآن کریم میں اس کی تفسیر کیا آئی ہے۔ یہ ہے 'لغات القرآن'۔ اب آپ نے سمجھ لیا کہ جس نے آج قرآن کریم کے متعلق کچھ کرنا ہو' اسے کس نہج سے یہ کرنا چاہیے۔ میں نے بہرحال ایک بنیاد رکھ دی ہے' ایک طرح ڈالی ہے' آنے والے جو علم وفضل میں مجھ سے زیادہ آگے ہونگے وہ اس پر مزید عمارتیں استوار کریں

[1] ڈاکٹر ایڈورڈ ولیم لین کی موت 1876ء میں واقع ہوئی۔

[2] اس کی مکمل توضیح کے لیے دیکھیے:

Lane, Edward William(1968). An Arabic-English Lexicon. Lebanon-Beirut: Librairie DU Leban.

[3] اس کا نام ہے: Mr.Edward Stanley Poole

[4] یہ اشارہ پرویزؒ کا اپنی ہی طرف ہے جب انہوں نے 1927ء میں انڈیا کی مرکزی حکومت (Central Sectariat) میں اپنی سروس کا آغاز کیا تھا۔

گے۔ بنیاد ہے یہ جو میں نے عرض کیا ہے۔ یہ وہ لغت ہیں' ان کے اندر یہ چیز موجود ہے' جس کا جی چاہے 'لسان العرب' اٹھالے' 'تاج العروس' اٹھالے' یہ کتابیں مستند ہیں' میرے لغت میں حوالے موجود ہیں۔

یہ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (4:34) اس لغت کے اندر دیا ہوا ہے۔ ان مرتبینِ لغت نے کہا ہے کہ قَامَ الرَّجُلُ الْمَرْاَۃَ وَ قَامَ عَلَیْھَا کے معنی ہوتے ہیں ''مرد نے عورت کی کفالت کی' اس کی ضروریات کو پورا کیا اور ان کا ذمہ دار ہوا' اس کے لیے رسد لایا۔ قوام کے معنی ہیں ''سامانِ رزق مہیا کرنے والا کیونکہ رزق سے معاشرتی زندگی کا توازن قائم رہتا ہے''۔ قَامَ عَلَیْھَا ''وہ اس کی ضروریاتِ زندگی کا ذمہ دار ہوا' وہ اس کے رزق پہنچانے کا کفیل بنا'' اور پھر انہوں نے اس کی شانِ نزول وغیرہ بھی دی ہیں کہ شانِ نزول تو اس کی یہ آئی ہے' تفسیر میں یہ آیا ہے اور محاورۂ عرب میں اس کے لیے جو مرادف لفظ تھے' وہ آئے۔ بات صاف ہوگئی کہ تقسیمِ کار کی رو سے مَردوں کے ذمہ یہ ہے کہ وہ عورتوں کی ضروریاتِ زندگی کے کفیل ہوں کیونکہ انہیں بچوں کی پرورش اور تربیت میں مصروف رہنا پڑتا ہے۔ اس کے معنی حاکم یا داروغہ (Darogah) نہیں ہیں۔ نیز قوم الشیء کے معنی ہیں ''کسی چیز کو صحیح طور پر برابر اور ہموار کر دینا یا درست کر دینا''۔

مرد ہو یا عورت' قرآنِ حکیم کے نزدیک ہر بنی آدم واجب التکریم ہے:

قرآنِ کریم نے پہلے' عورتوں اور مردوں کے متعلق یہ کہا تھا کہ: مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ (4:32) یاد رکھیے! Biologically' فطری طور پر' پیدائش کے اعتبار سے' ساخت کے اعتبار سے' مردوں کے اندر کچھ ایسے جوہر ہیں اور عورتوں میں بھی جن کے لیے بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ کہا ہے۔ قرآن حکیم نے یہ کہیں نہیں کہا ہے کہ مردوں کو عورتوں پر تفضیل ہے۔ قرآن حکیم نے عورتوں اور مردوں کا اکٹھا ذکر کیا ہے اور کہا یہ ہے کہ ایک کو دوسرے پر' اُس کو اِس پر' افضلیت ہے یعنی کچھ باتیں وہ ہیں جن کے اندر مردوں میں یہ جوہر زیادہ ہیں' کچھ وہ باتیں ہیں جن میں عورتوں کو تمہارے اوپر افضلیت ہے۔ اس لیے کسی طرح سے' اے عورتو! یہ نہ تصور کرلو کہ مرد ہم سے افضل ہیں' ہم تو کمتر ہیں۔ عورت اپنے ذہن میں یہ بات تصور نہ کرلے جو پتہ نہیں کتنے ہزار سال سے اس کے دل میں راسخ کر کے رکھ دی گئی ہے کہ تم کمتر ہو' تم ذلیل تر ہو' تم حقیر تر ہو' تم بے وقوف ہو۔ اور جب روٹی دینا اپنے ہی ہاتھ میں رکھ لیا جائے تو پھر تو وہ سب کچھ ہوتا ہے کہ یہ کم عقل ہے' کم تر ہے' ذلیل ہے' حقیر ہے' بے وقوف ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے کہ ''جیہدی کوٹھی اچ دانے اوہدے کملے وی سیانے'' (جس کے گھر اناج سے بھرے ہوں اس کے فاتر العقل بھی دانشور ہوتے ہیں)۔ مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ (4:32) اس لحاظ سے نہیں ہے۔ یہ فطری لحاظ سے ہے' یہ صلاحیتوں کے لحاظ سے ہے' یہ تقسیم کار کے لیے ہے۔

عورت بھی اپنی محنت کے ماحصل کی خود مالک بن سکتی ہے:

آ گے پھر یہ کہا ہے کہ یہ اکنامک پرابلم (معاشی مسئلہ) ہے۔تم یہ کہتے ہو کہ جو عورتیں ہیں' یہ کچھ نہیں کماسکتیں' مرد ہی کمانے والے ہیں' ان کی ہی پراپرٹی ہوسکتی ہے سنو! کہا ہے کہ: لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (4:32) عورتیں کما کیوں نہیں سکتی ہیں؟ یہ کماسکتی ہیں' بشرطیکہ ان کے پاس فاضل وقت بچتا ہو' وہ اپنے جو فطری وظائف ہیں' تقاضے ہیں' ان کو پورا کرنے کے بعد کماسکتی ہیں' افزائشِ نسل کے بعد' ان کی پرورش اور تربیت' کے بعد' اگر وقت ہے تو ٹھیک ہے یہ اکتساب کرسکتی ہیں۔ وہ اپنے اکتساب کی آپ مالک ہیں' تم ان کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے۔اور اس سے آگے یہی چیز ہے جو ہم نے کہی ہے کہ مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ (4:32) یہ تقسیمِ کار ہے' کچھ جوہر اِن میں ہیں' کچھ جوہر اُن میں ہیں' گھر کی زندگی کے اندر تقسیمِ کار ہوگی' عورت اپنے فرائض کو سرانجام دے گی تو اس کا بہت سا وقت اس کے اندر صرف ہوجائے گا اور وہ ایسے فرائض ہیں جو تم چاہو بھی تو سرانجام نہیں دے سکتے اس لیے اس کے شکر گزار بنو۔ وہ چاہے تو تمہارے فرائض کو سرانجام تو دے سکتی ہے لیکن اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے وہ Indispensable (ناگزیر) ہے۔ جب اس کو یہ سارا وقت دینا پڑے گا تو سوال یہ ہے کہ گھر کی زندگی میں تقسیمِ کار کیا ہو۔

گھریلو زندگی میں تقسیمِ کار کے فرائض

عزیزانِ من! تقسیمِ کار یہ ہو کہ: اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (4:34) عورتوں کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت مردوں کے ذمہ ہوگی تا کہ عورتیں اپنے ان فرائض کی سرانجام دہی کے لیے فارغ ہوجائیں' مطمئن ہوجائیں۔ یہ گھر کی زندگی میں تقسیمِ کار ہوگی جو قرآن حکیم نے کہی ہے۔ یہ میں نے عمومی کہا ہے۔ پہلے جب کہا ہے کہ عورت کما بھی سکتی ہے تو وہ یہ نقشہ نہیں ہے۔ٹھیک ہے وہ Economically Independent (اقتصادی طور پر آزاد) بھی ہے لیکن گھر کی زندگی میں کہا کہ عمومی نقشہ یہ ہوگا تا کہ وہ اپنے فرائض کی تکمیل میں مطمئن ہوجائے۔اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ مرد اس کی ضروریاتِ زندگی کے کفیل ہوجائیں۔اس لیے کہا ہے کہ: بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (4:34) اور اس کے لیے بہر حال وہ جو کچھ کما کر لاتے ہیں ان کو صرف کرنا پڑے گا تا کہ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (4:34)۔ اب ہم ان الفاظ کو الگ الگ لیتے ہیں کہ ان کا مفہوم کیا ہے۔

بیوی کی طرف سے خاوند کی اطاعت گزاری کا ذکر قرآنِ حمید میں نہیں ہے

عزیزانِ من! یہاں (4:34) میں کہیں نہیں لکھا کہ نیک عورتیں وہ ہیں جو اپنے خاوندوں کی اطاعت گزار ہوتی ہیں۔ یہ اس میں نہیں ہے' یہ ان کا اپنی طرف سے اضافہ ہے۔ یہاں فَالصّٰلِحٰتُ کہا ہے یعنی جو اس عورت کے اندر صحیح صلاحیتیں ہیں' ضرورت اس کی ہے کہ یہ صلاحیتیں' جتنی بھی اس کے اندر بحیثیت عورت ہیں' یہ ان فرائض کی سرانجام دہی کے لیے صرف کرے جو یہی سرانجام دے سکتی ہے' مرد سرانجام نہیں دے سکتے۔

قٰنِتٰتٌ کا لغوی اور قرآنی مفہوم:

عزیزانِ من! قرآن مجید کا لفظ دیکھیے اور جھوم جایئے۔ لفظ ہے قٰنِتٰتٌ۔ ہمارے ہاں اس لفظ کا ترجمہ فرمانبردار ہوگیا۔ عربی محاورے کی رو سے وہ لوگ لفظِ قٰنِتٰتٌ ان معنوں میں استعمال کرتے تھے کہ وہ صحراؤں میں جاتے' وہاں پانی کی بڑی کمی ہوتی تھی' ان کے ہاں مشکیزہ ہوتا تھا' مشکیزے میں پانی بھرتے تھے' ان کے ہاں سقاء قٰنِتٰتٌ لفظ تھا' کہ یہ ایک ایسا مشکیزہ ہے جسے پانی بھرنے کے بعد اس طرح سے بند کیا جائے کہ راستے میں جہاں ضرورت نہیں' وہاں تو اس میں سے ایک قطرہ نہ ٹپکے اور جہاں اس کی ضرورت ہو' وہاں اس کا منہ کھول دے' نہ ایسا ہو کہ راستے میں ٹپکتا چلا جائے' نہ ایسا کہ پیاس لگی ہوئی ہے منہ نہ کھلے' جہاں ضروری نہیں محفوظ رہے جہاں ضرورت ہے صحابِ کرم بن کر سامنے آئے۔ یہ ہے قٰنِتٰتٌ اور ایسا کرنے والی ہیں قٰنِتٰتٌ یعنی اس مقصد کو پورا کریں جس کے لیے انہیں وہ صلاحیتیں دی گئی ہیں۔ وہ عورتیں اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کرکے' انہیں صرف وہاں صرف کریں جہاں صرف کرنے کا حکم قوانینِ خداوندی کی رو سے ملے۔

ہمارے ہاں ایک تو یہ صالح کا لفظ ہے۔ میں نے عرض کیا ہے' عزیزانِ من! کہ ان تصورات کو Reconstruct (از سرِنو تشکیل) کرنا پڑے گا۔ آپ کو قرآن مجید کے تصورات کو' ترجموں کی رو سے نہیں لینا ہوگا' آپ کو متداول معنی کی رو سے نہیں لینا ہوگا' انہیں Reconstruct (از سرِ تشکیل) کریں گے۔ ''صلاحیت'' کا یہ لفظ تو آپ بولتے ہیں اور جب عملِ صالح آتا ہے تو ذہن میں کچھ اور نقشہ آجاتا ہے' آپ کے ہاں صالح ایک خاص ٹائپ بن گیا ہے۔ میں اس دور کی بات نہیں کرتا جو اس سے ذرا پہلے صالحین ہوتے تھے۔ اس کے معنی صلاحیت بخش کیوں نہیں لیے جاتے' مثلاً اس کی صلاحیتیں (Potentialities)۔ صلاحیتیں تو ہر ایک کے اندر ہوتی ہیں' کافر و مومن کے اندر ہوتی ہیں' آگے ان کا مصرف ہے' یہ مصرف قٰنِتٰتٌ ہے کہ یہ عورت کی صلاحیتیں ہیں' جہاں ان کے صرف کرنے کی ضرورت ہے وہ انہیں وہاں صرف کرے۔ اور جہاں ضرورت نہیں ہے' وہاں وہ حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَیۡبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ (4:34) ہو یعنی خدا نے ان کے تحفظ کا یہ کہہ کر انتظام کر دیا ہے کہ وہ اَلرِّجَالُ (4:34) مرد تو قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ (4:34) ہیں' وہ عورتوں کو ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائیں گے۔ جب یہ کچھ بھی ہم نے کرلیا' تمہارے اندر فطرت نے پیدائش میں خاص صلاحیتیں دی ہیں' وہ خاص فرائض کی سرانجام دہی کے لیے ہیں لہٰذا ان کی محافظت کرو کیونکہ اس تقسیمِ کار کی رو سے خدا نے تمہاری حفاظت کا سامان بہم پہنچادیا اور اس لیے تمہیں قٰنِتٰتٌ ہونا چاہیے۔

عورت کی اولین ذمہ داری افزائشِ نسل اور اس کی تربیت ہے:

آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن حمید یہ کہہ کر کیا کہتا چلا جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ (4:34) دیکھ لیجیے یہ صلاحیتیں وہ ہیں جو تمہاری جگہ کوئی دوسرا سرانجام نہیں دے سکتا' جو Opposite Group (جنس مخالف) ہے' وہ اس کو

سرانجام نہیں دے سکتا' تم ہی نے دینا ہے' افزائشِ نسلِ انسانی نہایت ضروری ہے' بچوں کی تربیت نہایت ضروری ہے کہ امت تم سے بنتی ہے' تم نے آنے والی امتوں کو' قوموں کو' متشکل کرنا ہے' تم میں یہ صلاحیتیں دی گئی ہے' مرد کا کام تو صرف باہر جا کر کمانا ہے' یہ افزائشِ نسل کے' پرورش کے' تربیت و تعلیم کے فرائض تمہیں سرانجام دینے ہیں' کہا ہے کہ ہم نے یہ انتظام کر دیا ہے۔ اور اس کے بعد کہا ہے کہ وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ (4:34) اس طرح سرکشی اختیار کرنے کی تحریک تمہارے اندر جاری ہو جائے کہ نہیں صاحب! یہ افزائشِ نسل والی بات غلط ہے' ہم مردوں کے کام کریں گی۔ اگر تم مردوں کے کام کرو گی تو فطرت کے پروگرام کی رو سے تمہارا کام کون کرے گا۔ کہا ہے کہ وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ (4:34) جس عورت سے تمہیں سرکشی کا تخافون ہو یعنی اس نے تمہیں یہ اختیار نہیں دیا' ذرا اس کا احساس ہوا' ڈر ہوا کہ ہاں کچھ تیور ایسے نظر آتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ چیز فطرت کی تقسیمِ کار کی ہو رہی ہے اور اس کے بعد معاشرے کو یہ حکم دیا جا رہا ہے۔ یہ میاں بیوی کا ذکر نہیں ہے۔ یہ اَلرِّجَالُ اور النِّسَآءِ کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ مردوں اور عورتوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ ایک تقسیمِ کار کا ذکر ہے' ایک معاشرے کی تشکیل ہو رہی ہے تو اس کے باوجود اگر کسی سے بغیر کسی قسم کے عذر کے یہ کیفیت ہو' اگر کہیں یہ چیز پیدا ہو تو آگے آئی ہے اس کی تفصیل۔

یک سوئی کے ساتھ فرائضِ فطرت کو سرانجام دینا:

کہا ہے کہ وَلَا تَتَمَنَّوۡا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعۡضَكُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ (4:32) اور جو دوسرے کے جوہر ہیں' خواہ مخواہ ان کی تمنا نہ کرو' نہ اس طرح کی ہوس لے آیا کرو۔ فطرت کے فرائض سرانجام دیا کرو۔ اگر تمہیں یہ محسوس ہو کہ یہ چیز کچھ اس قسم کی چلی جا رہی ہے' رجحان اس طرف سے آ رہا ہے کہ عورتیں بلا کسی معقول وجہ کے افزائشِ نسل سے سرکشی اختیار کر رہی ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ کہا ہے کہ فَعِظُوۡهُنَّ (4:34)۔ یہ معاشرے کو حکم دیا جا رہا ہے' یہ ایک خاوند کو حکم نہیں ہے کہ وہ بیوی کے ساتھ یہ کچھ کرے۔ عورتوں کے متعلق یہ حکم ہے۔ معاشرے سے کہا گیا ہے کہ فَعِظُوۡهُنَّ (4:34) انہیں سمجھاؤ بجھاؤ' انہیں دلائل دو۔ اگر وہ اس سے سرتابی کریں تو الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡهُنَّ (4:34) ان کو ان کی خوابگاہوں کے اندر الگ چھوڑ دو۔ وہ تو خاوندوں کو ساتھ لائیں گے' خاوندوں کی شمولیت ہو گی تو پھر یہ چیز ہو گی ان سے اس قسم کا جنسی تعلق قطع کر لو۔ یہ جو چیز ہے' یہ محبوس کر دینے کی بات ہے جیسے قرآن حمید نے پہلے بھی کہا ہے کہ جن سے تمہیں کسی قسم کا خطرہ ہو کہ کچھ بے حیائی کی بات نہ ہو جائے' تو ان کو گھروں میں روک لیا کرو' آگے کہا ہے کہ: وَاضۡرِبُوۡهُنَّ (4:34)۔ یہ اگلا Step (قدم) ہے' معاشرہ جو بھی اس کے لیے مناسب سمجھے' وہ کرے۔ اور کہا ہے کہ اگر یہ بات بھی نہ ہو اور یہ برائی سر بھی چڑھتی جائے تو معاشرے کو' عدالت کو' حکومت کو' یہ کہا گیا ہے کہ پھر تم بدنی سزا بھی دے سکتے ہو۔ آگے کہا ہے کہ: فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ (4:34)۔ یہ اَطَعۡنَكُمۡ کس کے لیے ہے؟ یہاں خاوند کا تو کہیں ذکر ہی نہیں آ رہا۔ جب وہ

اس پر آمادہ ہوجائیں کہ نہیں! ٹھیک ہے' اس کے لیے آجائیں' وہ قانون کی اطاعت کریں تو فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَیۡہِنَّ سَبِیۡلًا ؕ (4:34) خواہ مخواہ محض اس لیے کہ وہ عورتیں ہیں' ان پر ہاتھ نہ اٹھاؤ' پھر تم قطعاً ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیۡرًا (4:34) یاد رکھو! خدا کے قوانین غالب ہیں' وہ بالادست ہیں' وہ اس نظام کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔

عزیزانِ من! میری بصیرت کے مطابق اس کی شکل یہ ہے' قرآنِ کریم کی اس آیہ جلیلہ کا مفہوم یہ ہے' یہ ہیں ان الفاظ کے معنی' جس کا جی چاہے کتبِ لغت میں اٹھا کر دیکھ لے۔

ازدواجی زندگی کا ماحصل باہمی رفاقت مؤدت' سکینت اور رحمت ہے

اب سوال یہ ہوگا کہ ان لغات کے اندر جب یہ معانی دیئے ہوئے ہیں کہ یہ ہیں ''لسانِ عربی'' کی رُو سے ان کے معانی' اور دوسرا یہ کہ وہ معنی جو کسی روایت کی رو سے' کسی شانِ نزول کی رو سے' ہیں تو میں نے لسانِ عربی کی رو سے جو معانی ہیں' انہیں کیوں ترجیح دی؟ میں کیوں تصریفِ آیات کو ترجیح دیتا ہوں؟ میں نے عرض کیا ہے کہ دوسری بنیادی شرط یہ ہے کہ مفہوم وہ درست ہوگا جو قرآن حمید کی دوسری تعلیم اور آیات کے مطابق ہوگا کیونکہ قرآن مجید نے کہا ہے کہ میرے خدا کی طرف سے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں یہی نہیں کہ دو اختلافی حکم نہیں ہیں بلکہ قرآن حکیم کے اندر تعلیم کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ ایک جگہ تو ایک قسم کی ذہنیت پیدا کرے' دوسری طرف کچھ ایسی تعلیم دے کہ اس کے خلاف دوسری ذہنیت پیدا ہو رہی ہو۔ قرآن کریم یہ کبھی بھی نہیں کرے گا۔ اس لیے قرآن حکیم کی ان چیزوں پہ کھڑے ہو کر پہلے یہ دیکھیے اور جب آپ یہ دیکھیں گے کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ میاں اور بیوی کا رشتہ باہمی پسندیدگی کا ہے اور لَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرۡہًا (4:19) اگر اس میں ذرا سی بھی کراہت ہو تو وہ جو عورت ہے' وہ تمہارے لیے حلال نہیں رہ جاتی کہ تم اس کے مالک بن بیٹھو۔

عزیزانِ من! یہ ازدواج کا باہمی رشتہ ہے' رفاقت کا ہے اور اس کا نتیجہ مؤدت ہے' سکینت ہے' رحمت ہے۔ جب قرآن کریم یہ چیز کہتا ہے' اور پھر قانوناً کہتا ہے کہ ان کے حقوق اور ذمہ داریاں مساوی ہیں تو اس ساری تعلیم کو سامنے رکھیے' ان الفاظ کے معنی کتب میں دیکھیے کہ ''لسانِ عربی'' کی رو سے یہ معنی اس زمانے میں متداول تھے' وہ عرب اس لفظ کو یا ان دو لفظوں کو' ان معنوں میں استعمال کرتے تھے۔ اور اس کے بعد جو تفاسیر یا روایات رسول اللہ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں' اگر یہ روایات قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف جاتی ہیں تو وہ رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہو سکتیں۔

اس لیے اس نگاہ سے جو قرآن کریم پہ غور کرنے والا ہے' وہ کہے گا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی نہیں ہو سکتی۔

عزیزانِ من! یہ ہے میری بصیرت کے مطابق اس آیت کے معانی اور یہ ہے اس کا مفہوم۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انقلاب لانے کا طریقۂ کار

مندرجہ ذیل خط کے مضمون سے ملتے جلتے خطوط ادارہ کو اب بھی موصول ہوتے ہیں۔ ایسے مراسلات کا جواب آج بھی وہی ہے جو پرویز صاحب نے قریباً چوالیس برس قبل درجِ ذیل مراسلہ کا دیا تھا۔ تبدیلی اور اس کے طریق کار پر یہ ایک جامع و مانع تحریر ہے جسے آپ کی نذر کیا جا رہا ہے۔

ذیل کا خط ملاحظہ فرمایئے:

مکرمی و محترمی جناب پرویزؔ صاحب!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کی کتاب "ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION" پر ''پاکستان ٹائمز'' میں ریویو اور اس کے بعد اس پر ایک خط 25 اکتوبر 1969ء نظر سے گزرا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر سوچنے والے شخص کے سامنے یہی سوال ہے کہ:

The only thing which is missing from it is the methodology of bringing into being the "Rububiyat Order" which forms the core of Mr. Parwez's social and political philosophy.

ذہن یہ باور ہی نہیں کرتا کہ آپ جو اتنے عرصے سے اس راہ کے مسافر ہیں، اس کے جواب سے معذور ہوں۔ آپ کے پاس یقیناً اس کا جواب ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ جواب اُس منزل سے پہلے ظاہر کر دیا جائے جس میں وہ جواب عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ آپ کی طرح اس راہ پر چل رہے ہیں اور اس جگہ پہنچ گئے جہاں یہ سوال ان کے ذہن میں بھی پیدا ہو گیا (جیسے راقم الحروف اور اس کے چند ساتھی)۔ ان سے اس جواب کو ''چھپا کر رکھنا'' بھی ایک قسم کا بخل ہے جس کے آپ مرتکب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے از راہِ کرم مکمل طور پر یا چند سطور میں بطور مخلّص چند اشارات کی شکل میں راقم الحروف کو لکھ بھیجیں تو بندہ نوازی سے بعید نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بیش از بیش علم و حکمتِ قرآنی سے نوازے۔ فقط والسلام!

مجھے اس مضمون کے کئی خطوط، کئی ایک دیگر احباب کی طرف سے بھی موصول ہوئے ہیں۔ اس بنا پر (نیز مسئلہ کی اہمیت کا بھی یہی تقاضا تھا) میں نے مناسب سمجھا ہے کہ ان احباب کو فرداً فرداً جواب دینے کے بجائے (ماہنامہ) طلوعِ اسلام

کی وساطت سے، اس مسئلہ کی وضاحت کر دی جائے۔

میں سب سے پہلے محترم مستفسر کی خدمت میں عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بات یہ نہیں کہ میں اس اہم سوال کے جواب کو اس منزل سے پہلے ظاہر نہیں کرنا چاہتا جس میں وہ جواب 'عمل' میں لایا جا سکتا ہو۔ میں نے جس مقصد کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے رکھا ہے، اس میں کوئی راز ایسا نہیں جسے کسی خاص وقت تک کے لئے پوشیدہ رکھنا ضروری ہے— بلکہ یوں کہیے کہ اس میں راز کوئی بھی نہیں۔ اس میں تو کیفیت یہ ہے کہ — سخنے نکفتہ راچہ قلندرانہ گفتم ہے — اس قسم کی مصلحت کوشیاں، عملی سیاست کے میدان کے نبرد آزماؤں کے لئے ضروری ہوتی ہیں اور میں نے نہ اس میدان میں قدم رکھا ہے، نہ قدم رکھنے کا ارادہ ہے۔ اس لئے ہر چہ گویم قلندرانہ گویم۔ فالحمد للہ علی ذلک!

جہاں تک میری کتاب پر تبصرہ کے ضمن میں ان ریمارکس کا تعلق ہے جنہیں مندرجہ بالا خط میں دُہرایا گیا ہے، میں (محترم تبصرہ نگار سے معذرت کے ساتھ) جرأتِ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے یہ ریمارکس بے محل تھے۔ میری کتاب کا موضوع یہ ہے کہ اسلام، ایک دین ہے، مذہب نہیں اور جب تک اسے مذاہبِ عالم کے زمرے سے الگ نہیں کیا جاتا، نہ اس کی حقیقت سمجھ میں آ سکتی ہے، نہ اس کا مقصود و منتہیٰ۔ کتاب کا بیشتر حصہ، مذہب اور دین کے بنیادی فرق کی وضاحت پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد، میں نے مثبت طور پر بتایا ہے کہ قرآنِ کریم جس دین، (یعنی نظامِ حیات) کو پیش کرتا ہے، اس کے اصولی خط و خال کیا ہیں اور وہ دیگر نظام ہائے حیات سے کس طرح مختلف اور متمیز ہے۔ کتاب کی ساری بحث فکری ہے اور وہ اسلام کا صحیح تصور پیش کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب کے سلسلہ میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس میں اس نظام کو پاکستان میں عملاً متشکل کرنے یا نافذ کرنے کا طریقہ کیوں نہیں بتایا گیا۔

اس حقیقت سے ہر صاحبِ نظر واقف ہے کہ فکری راہنمائی اور عملی طریق کار دو الگ الگ شعبے ہیں۔ میں قرآنِ کریم کا ایک ادنیٰ سا طالب العلم ہوں اور اپنی فکری راہنمائی اسی سرچشمۂ ہدایت سے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ قرآنی راہنمائی زندگی کی مستقل اقدار اور اصولی حدود کی شکل میں ملتی ہے۔ یہ اقدار اور حدود غیر متبدل ہیں۔ قرآن وہ طریقے متعین نہیں کرتا جن کے مطابق ان اقدار و اصول کو ایک نظام یا معاشرہ کے محسوس پیکر میں منتقل کیا جائے گا۔ یہ طریقے حالات کے تقاضے کے مطابق، ہر دَور (بلکہ ایک ہی دَور کے مختلف اوقات) میں مختلف ہوں گے اور عندالضرورت ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے ان طریقوں کو خود متعین نہیں کیا۔ یہ جو ہمارے ہاں، اسلامی نظام کے سمجھنے میں اس قدر الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لوگوں نے، ان طریقوں کو بھی جو کسی زمانے میں، اس وقت کی ضروریات کے مطابق، حصولِ مقصد کے لئے وضع اور اختیار کئے گئے تھے، قرآنی اصول و اقدار کی طرح غیر متبدل اور ابدی سمجھ رکھا ہے۔ وہ

طریقے' اب زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے' اور ہمارا قدامت پرست طبقہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کو خلافِ اسلام قرار دے دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خود اسلام کے متعلق یہ خیال عام ہو رہا ہے کہ یہ کسی زمانے میں تو خوشگوار نتائج پیدا کر گیا تھا لیکن اب اس میں زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں' لہٰذا' ہمیں اس کے ساتھ چمٹے نہیں رہنا چاہئے۔ ایک قرآنی مفکر اس قسم کی غلطی نہیں کرتا۔ (یا یوں کہئے کہ اسے ایسی غلطی نہیں کرنی چاہئے)۔ وہ اپنے دَور کے مسائل پر غور کرتا اور ان کے متعلق جو قرآنی راہنمائی ملتی ہے' اسے فکری انداز سے قوم کے سامنے پیش کر دیتا ہے اور طریق کار ان لوگوں کے لئے چھوڑ دیتا ہے جو اس راہنمائی کے مطابق عملی عمارت استوار کرنا چاہیں۔ البتہ وہ اس باب میں اتنی احتیاط ضرور برتتا ہے کہ یہ دیکھے کہ جو عملی طریق اختیار کیا جائے وہ قرآن کے کسی اصول سے نہ ٹکرائے۔

یہ ہے وہ بنیادی حقیقت جسے نظر انداز کر دینے کا نتیجہ وہ اعتراض ہے جسے محترم تبصرہ نگار نے میری کتاب پر بھی وارد کیا ہے اور (دوسرے مقام پر) علامہ اقبالؒ پر بھی۔ ان کے متعلق بھی انہوں نے کہا ہے کہ اقبالؒ نے اپنے آپ کو فکری مباحث تک محدود رکھا اور حصولِ مقصد کے لئے عملی طریق کار تجویز نہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اقبالؒ کی دیدہ وری اور دور نگہی تھی جو انہوں نے ایک مفکر کے صحیح مقام اور منصب کو سمجھ لیا اور عملی طریق کار کو اس مرد سیاستدان کے سپرد کر دیا جس کی فراست اور دیانت پر انہیں اعتماد تھا۔ انہوں نے اپنے کلام میں ایک آدھ مرتبہ عملی طریق تجویز کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اربابِ نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اس میں وہ اس مقام تک نہ پہنچ سکے جو بہ حیثیت مفکر انہیں حاصل تھا۔ اور اسی لئے انہوں نے پھر اس کی کوشش نہیں کی۔ کلامِ اقبالؒ میں ان کی مثنوی —— پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق —— کو ایک خاص مقام حاصل ہے —— بہت بلند مقام —— اس مثنوی کے نام سے (جو ان کا اپنا تجویز کردہ ہے) واضح ہوتا ہے کہ اس وقت انہوں نے عملی طریق کار کے تعین کی اہمیت کو محسوس کیا تھا لیکن اس باب میں جو کچھ انہوں نے کہا وہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ وہ ان کی آزادانہ فکری تخلیق نہیں تھا' ماحول کے اثرات کا نتیجہ تھا اور اسی لئے اسے چنداں اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ اُس زمانے میں مسٹر گاندھی کی سودیشی تحریک کا عام چرچا تھا۔ چنانچہ اقبالؒ نے بھی اپنی قوم سے کہا تو یہی کہ

آنچہ از خاکِ تو رُست اے مردِ حُر
آں فروش و آں بپوش و آں بخور
آں نکو بیناں کہ خود را دیدہ اند
خود گلیمِ خویش را بافیدہ اند

(مفہوم: اے آزاد انسان جو کچھ بھی تمہاری سرزمین کی خاک سے پیدا ہوتا ہے اُسی سے بنائی ہوئی

اشیائے صرف کو استعمال میں لاؤ۔ یعنی غیر ملکی اشیاء کا بائیکاٹ کرو کیونکہ جو لوگ خود آگاہ ہوتے ہیں وہ اپنی گدڑی خود ہی سیتے ہیں۔ س۔ا)

اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ (اقبالؒ کو اپنا فکری مرشد تسلیم کرنے کے باوجود) قائد اعظمؒ کی عملی سیاست کی نگہ نتائج شناس نے طریق کار کے اس مشورہ کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور نہ اقبالؒ نے اس پر زور دیا — قائد اعظمؒ تو ایک طرف خود مسٹر گاندھی نے دو ہی قدم آگے جا کر اس طریق کو گردِ کارواں کی طرح پیچھے چھوڑ دیا تھا — حتیٰ کہ اہنسا (عدم تشدد) کو بھی جو اس کے نزدیک اس کے (مذہب) دھرم کا جزو تھا — عملی سیاست کے تقاضے ایسے ہی ہوتے ہیں۔

☆......☆......☆

اب آیئے ہم دیکھیں کہ قرآنی نظامِ ربوبیت جب (صدرِ اوّل میں) پہلی بار عملاً متشکل ہوا تھا تو اس کی صورت کیا تھی۔ لیکن اس سے پہلے، چند الفاظ میں اسے سمجھ لیجئے کہ اس نظام کی عمارت کس بنیاد پر استوار ہوئی تھی (اور استوار ہوگی)۔ وہ سنگِ تاسیس یہ تھا کہ

> ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق، مفوضہ امور کو نہایت محنت اور جانفشانی سے سرانجام دے اور اس کے ماحصل میں سے، بقدر اپنی ضرورت کے لے کر، باقی سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدے۔ بلکہ بعض حالات میں، دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھے اور اس کا نہ کسی سے اجر مانگے نہ معاوضہ۔ حتیٰ کہ کسی کے شکریہ تک کا بھی متمنی نہ ہو۔

یہ تھا اس نظام کا سنگِ بنیاد جو اسلام کا مطمحِ نظر تھا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تصور، نہ صرف اس نظامِ سرمایہ داری کے خلاف تھا جو اس زمانے میں عام تھا، بلکہ انسان کی طبیعی زندگی کے جبلی تقاضا (INSTINCT) کے بھی خلاف۔ انسان کی طبیعی زندگی کا جبلی تقاضا، مفادِ خویش کا تحفظ ہے۔ اسے کسی دوسرے کے مفاد کی کوئی فکر اور پروا نہیں ہوتی۔ اس لئے جو تقاضا، قرآنی نظام کا سنگِ بنیاد قرار پاتا ہے، وہ اسے اس کے جبلی تقاضوں سے بلند لے جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ (حیوانی سطح پر زندگی بسر کرنے والے) عام انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے خاص انداز کے انسان کی ضرورت ہے۔ اور انسانیت سازی درحقیقت قرآنی تعلیم کا مقصود ہے۔ اسی داخلی انقلاب سے وہ جذبۂ محرکہ پیدا ہوتا ہے جس سے انسان اتنے بڑے ایثار کے لئے بطیبِ خاطر تیار ہو سکتا ہے۔ اس نظام کی تشکیل کے لئے جب نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز کیا، تو اس وقت (حضورؐ کے سوا) دنیا میں کوئی مسلمان نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے اس نظامِ نَو کے اصول و اقدار اپنی قوم کے سامنے پیش کئے اور پیش کرتے چلے گئے۔ قوم نے اس دعوت کی مخالفت کی لیکن ان میں ایسے افراد بھی تھے جنہوں نے اس پرسکون

واطمینان سے غور وفکر کیا اور اس کے بعد، جب وہ اس کی صداقت کے متعلق، دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کر لیا۔ اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دیتے تھے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اس زمانے میں وہی لوگ مسلمان کہلاتے تھے جو اپنے قلب ودماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ، اس نظام کی صداقت کے قائل ہو چکے تھے۔

جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے، ان کی تعلیم وتربیت کا خصوصی انتظام خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔ قرآنِ کریم نے جو حضورؐ کی یہ خصوصیتِ کبریٰ بیان کی ہے کہ **یعلمهم الکتاب والحکمة ویزکیهم** تو وہ اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔ یعنی حضورؐ انہیں اس نظام کے قوانین وضوابط کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کی حکمت وغایت سے آگاہ کرتے تھے اور اس طرح ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے چلے جاتے تھے۔ ''صلاحیتوں کی اس نشوونما'' سے مراد، صرف ذہنی صلاحیتیں نہیں، اس سے مفہوم ان صلاحیتوں کی نشوو ارتقاء بھی ہے جن کی بنیادوں پر انسانی سیرت وکردار کی بلند وبالا عمارت استوار ہوتی ہے۔ اسے انسانی ذات کی نشوونما کہا جاتا ہے۔ اسی سے ابن آدم، حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور یہی چیز جذبہ محرکہ بنتی ہے اس عظیم ایثار کا جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ جب ان میں سیرت وکردار کی اس قسم کی پاکیزگی اور پختگی پیدا ہو جاتی ہے، تو ان سے ایک عہد لیا جاتا ہے جو درحقیقت اسلامی نظامِ ربوبیت کی اساس ہے یعنی یہ عہد کہ

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ (9:111)

یہ حقیقت ہے (یونہی ذہنی عقیدت مندی نہیں) کہ مومنین نے اپنا مال اور اپنی جان خدا کے ہاتھوں فروخت کر دیئے ہیں اور خدا نے انہیں جنت کے عوض خرید لیا ہے۔

اسی جماعت کے افراد کو مومن کہا جاتا تھا۔ یعنی وہ لوگ:

(1) جنہوں نے سوچ سمجھ اور دیکھ بھال کر، برضا ورغبت، اس نظام کی صداقت کو قبول کیا۔

(2) ان کی تعلیم وتربیت خود رسولؐ اللہ نے فرمائی اور اس طرح ان کے قلب ونگاہ میں قرآنی اقدار کے مطابق انقلاب پیدا ہوتا چلا گیا۔ اور

(3) انہوں نے اپنی جان اور مال اسی نظام کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

رسولؐ اللہ کی مکی زندگی پوری کی پوری اسی عملِ تزمیل [1] (جماعت سازی) میں بسر ہوگئی اور تیرہ سال کے عرصہ میں جو

---

[1] رسولؐ اللہ کو اسی جہت سے قرآن میں المزمل کہا گیا ہے یعنی وہ جو رفقائے سفر کے انتخاب میں انتہائی کاوش واحتیاط سے کام لے۔

افراد اس سوسائٹی کے ممبر بنے' ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ اگر ہم اپنے اندازوں کے مطابق ماپیں تو یہ پروگرام بڑا سُست خرام دکھائی دے گا۔ آپ غور کیجئے کہ حضوؐر کی عمرِ رسالت صرف تیئس سال تھی اور آپ کا عہدِ رسالت قیامت تک کے عرصہ کو محیط تھا۔ اس اعتبار سے حضوؐر کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک سانس صدیوں پر بھاری تھا۔ اس تیئس سال کے گراں بہا عرصہ میں سے تیرہ سال کی مدت ابتدائی عملِ تزمیل میں صرف ہوگئی اور اس کا ماحصل چند سو افراد سے آگے نہ بڑھا۔ اور حضوؐر کی طرف سے یہ سب کچھ نہایت سکون وسکوت کے ساتھ ہوا۔ جو حضرات بنیادی نظریات کی تبلیغ وتعلیم کے مرحلہ کو ''بے عملی'' سے تعبیر کرتے ہیں اور عمل کا تصور ان کے ہاں ہنگامہ خیزی اور شورش انگیزی ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک حضوؐر کی یہ تیرہ سالہ زندگی تو ''بے عملی'' کا دَور کہلائے گی!

اس جماعتِ مومنین کی مکی زندگی ایک اور اہم حقیقت کی بھی پردہ کشا ہے۔ لوٹ مار' جنگ وجدال' فتنہ وفساد' عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا' اور اس جماعتِ نَو کے افراد انہی عربوں میں سے تھے۔ اس تیرا سال کے عرصہ میں' اس جماعت کے افراد پر ہر قسم کے مظالم ہوئے۔ انہیں ناقابلِ برداشت تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ان میں سے کسی نے نہ کسی قسم کا دنگا فساد کیا' نہ لڑائی جھگڑا' نہ کسی کو لوٹا نہ کھسوٹا' نہ کہیں پتھراؤ کیا نہ گھیراؤ۔ حتیٰ کہ نہ کہیں جھوٹ بولا نہ کسی کو فریب دیا' نہ کسی سے بدمعاملگی کی' نہ کسی قسم کی عہد شکنی۔ تکلیفیں برداشت کرتے رہے' مصیبتیں اٹھاتے رہے۔ لیکن فریق مقابل کے خلاف نہ جھوٹا پراپیگنڈہ کیا' نہ کسی قسم کی غلط بیانی سے کام لیا' نہ کوئی سازش کی' نہ زمین دوز تحریک چلائی۔ جو کچھ کہا کھلے بندوں کہا۔ جو کچھ کیا علی الاعلان کیا۔ اپنے کام سے کام رکھا۔ اور جب دیکھا کہ مکہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضاء اس نظام کے قیام کے لئے زیادہ سازگار ہے تو نہایت خاموشی سے ہجرت کر کے وہاں چلے گئے اور جاتے وقت بھی کسی کو کسی قسم کا دھوکا دیا' نہ خیانت کی۔

مدینہ گئے تو وہاں کسی سے حکومت نہیں چھینی۔ نہ ہی ایسا ہوا کہ کوئی بنی بنائی حکومت کسی نے ان کے حوالے کر دی ہو۔ وہاں انہوں نے اپنی مملکت قائم کی — ''مملکت قائم کی'' کے الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مملکت قائم کس طرح سے کی گئی تھی۔ اس کے لئے طریق کار کیا اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں قرآن پھر ایک اصول بیان کرتا ہے اور وہ اصول ایسا جامع ہے جس میں تمام تفاصیل خود بخود سمٹ کر آجاتی ہیں۔ سورۃ النورؔ میں ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55)

یعنی یہ مملکت نہ کسی سے چھین جھپٹ کر لی گئی تھی نہ کسی نے بطور بخشائش ہبہ کر دی تھی۔ یہ فطری نتیجہ تھی ان کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کا — ایمان — یعنی اپنے نصب العین کی صداقت پر یقین محکم۔ اور اعمالِ صالحہ — قرآنی اقدار واصول کے اندر رہتے ہوئے' موقعہ اور محل کے مطابق مناسب اقدامات۔ (واضح رہے کہ قرآن نے ''اعمالِ صالحہ'' پر اتنا زور دیا ہے

لیکن ان اعمال کی کوئی جامع ومانع فہرست مرتب کر کے نہیں دی۔ حتیٰ کہ اس نے ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کو جماعت ِمومنین اور مملکتِ اسلامیہ کا بنیادی فریضہ قرار دیا ہے لیکن (بجز چند احکام) معروف ومنکر کی تفاصیل بھی خود متعین نہیں کیں۔

جب یہ جماعت صاحبِ اقتدار ہوگئی۔ یعنی وسائلِ رزق ان کے قبضہ میں آ گئے تو معاشرہ میں نظامِ ربوبیت خود بخود نافذ ہوگیا۔ بالفاظِ دیگر یوں کہئے کہ یہ کاروان' مختلف وادیوں میں سے گزرنے کے بعد' اپنی منزلِ مقصود تک جا پہنچا۔ اُس وقت نہ کسی نے یہ سوال اُٹھایا کہ مملکت تو مل گئی ہے' اب اس میں کس قسم کا نظام قائم کیا جائے۔ نہ یہ تنازعہ پیدا ہوا کہ فلاں قسم کا معاشی نظام اسلامی ہے یا غیر اسلامی —— انہوں نے چلنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم نے پہنچنا کہاں ہے۔ اس لئے منزلِ پر پہنچنے کے بعد' کسی کے دل میں یہ سوال نہ اُبھرا کہ یہ ہماری منزلِ مقصود ہے یا نہیں۔ ان میں سے ہر فرد جو اس سوسائٹی کا ممبر بنا تھا' سب کچھ دیکھ بھال' سوچ سمجھ کر' ممبر بنا تھا۔ ان میں سے ہر ایک کو معلوم تھا —— اور حتمی اور یقینی طور پر معلوم' کہ اس سوسائٹی کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہمارا فریضہ کیا۔ یہ افراد' اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے بعد' اپنے آپ کو' اُس مقصد کے حصول کے لئے تیار کرنے اور اس کے اہل بننے میں مصروف رہے۔ جب انہوں نے اپنے اندر اس کی اہلیت پیدا کر لی' تو مقصد حاصل ہوگیا۔ یعنی اسلامی نظام قائم ہوگیا۔ اس کے بعد یہ لوگ اس نظام کے استحکام وفروغ اور اندرونی اور بیرونی خطرات سے اس کی حفاظت ومدافعت کے لئے مصروفِ جدوجہد رہے۔ یہ ہے وہ ''طریق'' جس کے مطابق صدرِ اوّل میں یہ نظام قائم ہوا۔ یعنی اس نظام کے اصول واقدار کو بہ دلائل وبراہین دوسروں کے ذہن اور دل نشین کرانا' اور جو اس طرح ان کی صداقت تسلیم کر لیں' مناسب تعلیم وتربیت سے' ان کی انسانی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا' یہی ہے وہ پروگرام جسے میں نے شروع میں انسانیت سازی سے تعبیر کیا ہے۔

☆......☆......☆

اب آپ تاریخ کے اوراق کو چودہ سو سال آگے اُلٹ کر' پاکستان کی طرف آ جایئے۔ یہاں ایک ایسی قوم بستی ہے جو مسلمان کے نام سے متعارف تو ہے لیکن:

(1) ان میں سے نہ کسی نے' اسلام کو سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر' دل اور دماغ کے کامل اطمینان کے ساتھ' بطیبِ خاطر اختیار کیا ہے۔

(2) نہ ہی ان کے سامنے اسلام کا کوئی واضح اور متعین مفہوم ہے۔

(3) نہ ہی انہیں حتمی طور پر معلوم ہے کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں اور اس کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے۔ اور جو اسلام ان کے ہاں مروّج ہے' وہ' وہ مذہب ہے جو انفرادی اور گروہی مفادات کے تحفظ کے لئے ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع کیا گیا۔

(4) نہ ہی (صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی طرح) ان کی تعلیم وتربیت کا کوئی انتظام ہوا ہے۔
(5) نہ ہی انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے' اپنی جان اور مال کو کسی کے ہاتھ فروخت کر دینے کا معاہدہ کیا ہے۔ اور
(6) نہ ہی یہ مملکت انہیں' ان کے ایمان واعمالِ صالح کے نتیجہ میں ملی ہے۔
یہاں حالت یہ ہے کہ:
(1) یہ قوم' متفق علیہ طور پر اتنا بھی نہیں بتا سکتی کہ مسلمان کہتے کسے ہیں۔
(2) کوئی معاملہ پیش آئے۔ ایک گروہ اسے اسلامی قرار دیتا ہے اور دوسرا غیر اسلامی۔ کوئی اسے جائز ٹھہراتا ہے کوئی ناجائز' ذرا ذرا سی بات پر ان میں باہمی سر پھٹول ہوتی ہے۔ ان کی بیویوں پر طلاق پڑتی ہے' ان پر کفر کے فتوے صادر ہوتے ہیں اور کوئی اتھارٹی ایسی نہیں جسے متنازعہ معاملات میں حکم تسلیم کیا جاتا ہو۔

اور تماشہ یہ کہ کوئی اس باب میں (SERIOUS) نہیں کہ اس راہ گم کردہ قافلہ کے لئے منزل کا تعین اور راستے کی وضاحت کی جائے۔ ایک طرف حکومتیں آتی رہیں اور جاتی رہیں اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ رہی کہ مملکت کا نام اسلامی رکھ کر اور آئین میں یہ شق داخل کر کے کہ ملک کا کوئی قانون اسلام (یا کتاب وسنت) کے خلاف نہیں ہوگا' مُلّا سے جان چھڑاؤ اور عوام میں سستی شہرت حاصل کرو۔ دوسری طرف' اربابِ مذہب کی یہ کیفیت کہ اُن میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جنہوں نے اسلام کے لفظ کو اپنی مفاد پرستیوں کے لئے سپر بنا رکھا ہے اور کچھ وہ جو ''مذہبی علوم'' سے تو واقف ہیں لیکن اسلام کی حقیقت سے قطعاً ناآشنا ہیں اور نہ خود جہالت کی تاریکی سے نکلنا چاہتے ہیں' نہ اپنے معتقدین کو نکلنے دینا چاہتے ہیں۔ ان کے بعد ایک گروہ ایسا بھی ہے جو (مذکورہ بالا حالات سے متأثر ہو کر) اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے' اب یہ ہمارے کسی کام نہیں آ سکتا۔ یہ گروہ دل میں تو اس کا قائل ہے' لیکن معاشرتی دباؤ کے ماتحت اپنے اس عقیدہ کو اعلانیہ زبان تک لانے کی جرأت نہیں کرتا — یہ حضرات' ڈرائنگ رومز میں بیٹھے' گھنٹوں ان خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور اس کے بعد اُٹھ کر سیدھے ''داتا صاحب'' پہنچ جاتے ہیں۔

یہ ہے یہاں کی مسلمان قوم اور یہ ہیں اس قوم اور ملک کے حالات! اور اس کے بعد مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ (تم نے قرآن پر غور وفکر کیا ہے) تم بتاؤ کہ (اس قوم میں کسی قسم کی تبدیلی کئے بغیر) یہاں قرآن کا معاشی نظام (نظامِ ربوبیت) کس طرح نافذ کیا جائے؟

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا!

اگر کسی نے پوچھنا ہے تو یہ پوچھے کہ (اقبالؔ کے الفاظ میں) اس ''مسلمانے نامسلمانے'' کو ''مسلمان'' کس طرح بنایا

جائے تا کہ اس کے بعد یہاں کا معاشرہ' قرآنی معاشرہ میں بدل جائے اور موجودہ غلط معاشی نظام کی جگہ نظامِ ربوبیت آ جائے۔ نظامِ ربوبیت' کوئی خودکار مشین نہیں' جسے کہیں سے امپورٹ کر کے یہاں نصب کر دیا جائے اور سوئچ دبا دینے سے وہ چلنے لگ جائے۔ نظامِ ربوبیت' دل کی گہرائیوں سے اُبھرنے والی' اُمنگوں کے محسوس پیکر کا نام ہے اور یہ کسی ایسی قوم میں نفاذ پذیر نہیں ہوسکتا جس کے اعماقِ قلب میں اس قسم کی تبدیلی نہ پیدا ہوئی ہو۔ ہم تو نسلی مسلمان ہیں۔ جو بدوؔ اسلامی مملکت کے قیام کے بعد (دل کی تبدیلی کے بغیر' کسی اور تقاضا سے) حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے تھے' قرآن نے ان کے متعلق کہہ دیا تھا کہ — قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا — یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قُلْ۔ ان سے کہہ دو۔ لَّمْ تُؤْمِنُوْا۔ تم ایمان نہیں لائے۔ اس لئے ایسا مت کہو۔ وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا — تم صرف یہ کہو کہ ہم اس نظام کے سامنے جھک گئے ہیں۔ اس لئے کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔ ایمان ہنوز تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا۔ اس کے بعد' جب تمہاری مناسب تعلیم و تربیت ہو جائے گی اور تم' اپنے دل کی کامل رضامندی سے' اس نظام کی اطاعت کرو گے' تو پھر تمہارے اندر وہ تبدیلی پیدا ہو جائے گی جسے ایمان کہہ کر پکارا جاتا ہے (49:14)۔

آگے بڑھنے سے پہلے' میں اس حقیقت کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہم مسلمان' اگر قلب و نگاہ کی تبدیلی سے مسلمان نہیں ہوئے' تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں موجودہ مسلمانوں کی قومی (اجتماعی) زندگی کو بیکار سمجھتا ہوں۔ بالکل نہیں۔ جب کوئی قوم' اقدار (یا آئیڈیالوجی) کے اشتراک کی بنا پر' اپنی اجتماعیت سے محروم ہو جائے لیکن وہ اس کے باوجود انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی بسر کرنا چاہے' تو اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی وجہ تعارف کو اپنی اجتماعیت کی بنیاد قرار دے لے اور اس طرح اپنے افراد کو تنکوں کی طرح منتشر ہونے سے بچا لے۔ اس قسم کی اجتماعی زندگی' انفرادی زندگی سے بہر حال بہتر ہوتی ہے بشرطیکہ اس سے' دوسروں کے خلاف نفرت کے جذبات اور سلب و نہب کی ہوس نہ اُبھرے۔ میں نے' تقسیم ہند سے پہلے' مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کو برقرار رکھنے اور اسے مستحکم کرنے کے لئے (اپنی بساط کے مطابق) جو کچھ کیا اس کا جذبۂ محرکہ یہ تھا کہ قوم کی اس ہیئت کو بہر حال قائم رکھا جائے تا کہ اس اجتماعیت سے اگر ہمیں ایک آزاد خطۂ زمین حاصل ہو جائے تو اس میں قرآنی نظام کے قیام کا امکان ہو۔ ہندوستان کا ایک جزو رہتے ہوئے اس کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

اور تقسیم ہند کے بعد' میں نے اس امکان کو مشہود بنانے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ اس کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ (جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے) اس ''مسلمانِ نا مسلمانے'' کو مسلمان بنا دیا جائے — وہ مسلمان جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ:

''زباں'' سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

میں نے اس کے لئے' سنتِ رسولؐ اللہ کے اتباع میں' طریقہ وہی اختیار کیا جسے حضورؐ نے اپنی دعوت کے آغاز میں اختیار فرمایا تھا۔ یعنی میں نے:

(1) سب سے پہلے' اپنی قوم سے کہا کہ ہمارا مروّجہ اسلام' دین نہیں رہا' مذہب میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اسے جب تک دین میں تبدیل نہیں کیا جائے گا' مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوں گے۔ میں نے گذشتہ بیس بائیس سال میں جو ہزارہا صفحات لکھے ہیں' تقریریں کی ہیں' درس دیئے ہیں' وہ سب اسی مقصد کے لئے تھے۔ میں نے پہلے دین اور مذہب میں فرق کر کے بتایا اور پھر مثبت طور پر دینؔ کا قرآنی تصور قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی' جو اہم معاملہ قوم کے سامنے آیا' اس کے متعلق وضاحت سے بتایا کہ قرآن اس باب میں کیا راہنمائی دیتا ہے۔

(2) میں نے اربابِ بست وکشاد اور اصحابِ فکرونظر سے کہا کہ موجودہ مسلمانوں سے (جیسے کچھ بھی ہیں) مملکتِ پاکستان کو محفوظ رکھنے اور مستحکم بنانے کا کام لیا جائے' لیکن ہماری نئی نسلوں کی تعلیم وتربیت کا ایسا انتظام کیا جائے جس سے ان کے قلب ونگاہ میں وہ تبدیلی پیدا ہوجائے جسے ایمانؔ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ہوگی وہ قوم جسے صحیح معنوں میں ''ملتِ اسلامیہ'' کہہ کر پکارا جائے۔ اس ملت کے وجود میں آجانے سے اسلامی معاشرہ وجود میں آجائے گا اور انہی کے قلوب سے ابھرنے والی امنگوں سے نظامِ ربوبیت قائم ہوگا۔ اس کے لئے عملی طریق کیا اختیار کیا جائے گا' اسے' وہ ملت' اس وقت کے حالات کے مطابق' خود طے کرلے گی۔

یہ ہے اسلامی نظام قائم کرنے کا وہ طریقہ جسے میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق سمجھ سکا ہوں اور جسے منہاجِ رسالت پر تدبر وتفکر کے بعد میں نے (اپنی استعداد کے مطابق) اختیار کر رکھا ہے' اس فرق کے ساتھ کہ حضورؐ نے تبلیغ دین کے ساتھ' ایک الگ جماعت (اُمت) کی تشکیل بھی فرمائی تھی اور میں نے الگ جماعت سازی سے سخت اجتناب کیا ہے اور اپنے آپ کو صرف ایک مبلغ کی حیثیت تک محدود رکھا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ایک رسولؑ' اپنے پیغام کے نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیتا ہے اور جو لوگ اس پیغام کی صداقت کو قبول کر لیتے ہیں انہیں' ان کو کفار سے الگ کر کے' ایک متمیز اُمت کی تشکیل کرتا ہے۔ لیکن میں تو پوری کی پوری اُمتِ محمدیہ کو' دنیا کے جملہ غیر مسلموں (کفار) کے مقابلہ میں' ایک جماعت سمجھتا ہوں' اس لئے اس امت کے اندر' کافر ومسلم کی تفریق کا تصور بھی میرے نزدیک معصیتِ کبریٰ اور جرمِ عظیم ہے۔ امتِ محمدیہ کے اندر کافر ومسلم کی تفریق تو ایک طرف' قرآنِ کریم' اس امت کے اندر فرقہ بندی کو بھی شرک قرار دیتا ہے (30:31)۔ اور رسولؐ اللہ سے کہتا ہے کہ ایسا کرنے والوں کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا (6:160)۔ اس لئے میں ایک الگ جماعت بنانے کی جرأت کیسے کرسکتا ہوں۔ میں دین کے متعلق قرآنی تصورات کو عام کئے جارہا ہوں اور جو لوگ ان تصورات سے متفق ہوجاتے ہیں' ان سے کہتا ہوں کہ وہ بھی اسی طرح انہیں عام کرتے جائیں تاکہ ہماری پوری قوم کے سامنے دین کے

صحیح تصورات آ جائیں۔ اسی طرح جب میں، قوم کی نئی نسل کے لئے قرآنی تعلیم وتربیت پر زور دیتا ہوں اور اب (بالآخر) خود ایک درسگاہ قائم کرنے کی تجویز کو آگے بڑھا رہا ہوں، (افسوس کہ درس گاہ کا خواب کبھی پورا نہ ہو سکا۔ س۔ا) تو یہ بھی پوری قوم کے بچوں کے لئے کر رہا ہوں، کسی خاص گروہ یا پارٹی یا کسی خاص طبقہ کے بچوں کے لئے نہیں۔ میرا منصب مسلمانوں کے سامنے اس دینؔ کا صحیح تصور لانا ہے جس کی طرف نسبت سے وہ (اور ہم) اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ جب ان کے سامنے دینؔ کا تصور آ جائے گا اور ان کے دل و دماغ میں قرآنی تبدیلی پیدا ہو جائے گی، تو وہ، موجودہ غیر اسلامی نظامِ زندگی کو قرآنی نظام میں بدلنے کے لئے طریق کار خود تجویز کر لیں گے۔ یہ ہے میرا مشن۔

من از طریق نہ پرسم، رفیق می جویم
کہ گفتہ اند نخستیں رفیق باز طریق!

(مفہوم: میں راہ نہیں پوچھتا، میں تو ہم راہ ڈھونڈ رہا ہوں ضرب المثل ہے کہ پہلے رفیق پھر طریق!
س۔ا)

اس سلسلہ میں مجھ سے اکثر کہا جاتا ہے کہ جس منزل کی تم نے نشاندہی کی ہے، اس سے تو ہم متفق ہیں لیکن اس تک پہنچنے کے لئے جو راستہ تم تجویز کرتے ہو وہ بہت لمبا ہے اور زمانہ آج بڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس لئے یہ تو —— تا تریاق از عراق آوردہ شود، مار گزیدہ مردہ شود —— والا معاملہ ہے۔ اس کے لئے کوئی (SHORT-CUT) ہونا چاہئے۔

یہ اعتراض (بظاہر) بڑا وزنی دکھائی دیتا ہے اور میں نے دیکھا ہے کہ اکثر عجلت پسند طبائع اس سے متأثر بھی ہو جاتی ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ قرآنِ کریم (یا اسوۂ رسولؐ اللہ) سے مجھے کوئی (SHORT CUT) ملتا نہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے، قرآن کے تجویز کردہ راستے کی لمبائی اور رفتار کی (بظاہر) سُستی کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی گراں قدر عمرِ رسالت کا قریب ساٹھ فیصد حصہ، مکی زندگی کے تبلیغی مرحلہ میں گزرا اور اس کا ماحصل چند سو نفوس سے زیادہ دنیا کے سامنے نہ آیا۔ اس کے بعد مدنی زندگی کا ابتدائی دَور بھی، مخالفتوں کے ہجوم کے مقابلہ اور مدافعت میں گزرا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اس محنتِ شاقہ سے کاشت کردہ کھیتی کو اپنے سامنے برومند ہوتا دیکھنے کی آرزو خود حضورؐ کے دل میں بھی بیدار ہوتی لیکن بارگاہِ خداوندی سے جواب ملتا کہ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40)۔ ''جو کچھ ان لوگوں سے کہا جاتا ہے اگر اس کا کچھ حصہ تیری زندگی میں سامنے آ جائے، یا تو اس سے قبل ہی وفات پا جائے، تو اس سے تیرے پروگرام پر کچھ اثر نہیں پڑنا چاہئے۔ تیرا کام یہ ہے کہ تو اس پیغام کو لوگوں تک پہنچائے چلا جا۔ یہ دیکھنا ہمارا کام ہے کہ ہمارے قانونِ مکافات کی رُو سے اس کے محسوس نتائج کب سامنے آتے ہیں''۔

آپ نے غور فرمایا کہ داعیٔ انقلاب کی اس معصوم وحسین آرزو کے باوجود' کوئی چھوٹا متبادل راستہ تجویز نہیں کردیا گیا۔ ''تبلیغ'' کا وہی طول طویل پروگرام برقرار رکھا گیا اور اسی پر مستقل مزاجی سے عمل پیرا رہنے کی تاکید کی گئی۔ جب راستے کی طوالت کو حضور رسالت مآبؐ کے لئے بھی مختصر نہیں کیا گیا تو ہم آپ کس قطار شمار میں ہیں۔ خدا کے مقرر کردہ قوانین اٹل ہیں اور ان میں کسی کی خاطر بھی تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا' ہمارے لئے دو ہی راستے ہیں۔ اگر ہم نے قرآن کی متعین کردہ منزل تک پہنچنا ہے —— یعنی اپنے ہاں قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ کرنا ہے تو اس کے لئے پروگرام بھی وہی اختیار کرنا ہوگا جسے قرآن نے تجویز کیا ہے۔ یعنی قلب ونگاہ کی تبدیلی سے ''مسلمانِ نامسلمانے'' کو مسلمان بنانا' تاکہ وہ نظام اس کے ایمان واعمالِ صالح کے فطری نتیجہ کے طور پر متشکل ہوسکے۔ اس راستے کو قرآن نے **العقبۃ** سے تعبیر کیا ہے یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنا —— پہاڑ کی گھاٹی پر تیز قدمی سے چڑھا جا ہی نہیں سکتا۔ ویسے اگر کوئی ہنگامی طور پر قرآن کے معاشی نظام کو یہاں نافذ کرنا چاہتا ہے' تو اسے حکومت قانوناً نافذ کرسکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مفاد پرست گروہ اسے جبر سے تعبیر کرے گا لیکن قانوناً اسے جبر نہیں کہا جاسکے گا۔ اس لئے کہ جب مسلمان' قرآن پر ایمان رکھنے کا اقرار کرتے ہیں تو قرآن کے کسی حکم کی اطاعت کو وہ جبر کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ لیکن یہ محض ایک ہنگامی اور وقتی تدبیر ہوگی۔ اسے نہ دوام وثبات حاصل ہوسکے گا اور نہ ہی دیانت دارانہ طور پر عمل ہوگا۔ دیانتدارانہ عمل اسی قانون پر ہوسکتا ہے جس کا تقاضا انسان کے دل سے اُبھرے۔ خارج سے وارد کردہ قوانین کی اطاعت طوعاً وکرہاً ہی کی جاتی ہے اور جن لوگوں کے مفاد پر اس سے زد پڑتی ہو' وہ ہر وقت اس سے گریز کی راہیں تلاش کرنے یا تراشنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اسے دوام وثبات اسی صورت میں حاصل ہوسکے گا جب یہ اس قوم کے ہاتھوں متشکل ہو جس کے قلب ودماغ میں وہ تبدیلی آچکی ہو جس کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اس کا بھی انتظام رکھے کہ ان آنے والی نسلوں کی ذہنیت بھی قرآنی سانچوں میں ڈھلتی رہے (جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں) قرآنی نظامِ ربوبیت کی بنیادی اینٹ یہ ہے کہ

> ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق' مفوضہ کام کو پوری پوری محنت سے سرانجام دے اور اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دے۔ بلکہ ہنگامی اوقات میں' دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضرورت پر ترجیح دے۔

آپ سوچئے کہ ایسا نظام جس کا سنگِ تاسیس یہ ہو' قلب ونگاہ کی تبدیلی کے بغیر کسی صورت میں قائم ودائم رہ سکتا ہے اور قلب ودماغ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے تو یقیناً وقت لگے گا اور اس مدت کو ہمیں ہمت اور حوصلہ سے برداشت کرنا پڑے گا۔

لیکن اگر ہم اتنے لمبے وقت کا انتظار نہیں کرسکتے' تو پھر ہمیں قرآنی منزل کو اپنے سامنے رکھنا ہی نہیں چاہئے۔ سیدھے

طور پر اپنی منزل آپ متعین کر لینی چاہئے اور اس تک پہنچنے کے راستے بھی خود ہی تجویز کر لینے چاہئیں۔لیکن پھر دیانتداری کا تقاضا ہے کہ ہم اس پر اسلام کا لیبل نہ لگائیں۔ میں نے ملک کے ذمہ دار حضرات سے شروع ہی میں کہا تھا کہ جب وہ اسلام' اسلام پکارتے ہیں تو انہیں چاہئے کہ پہلے اچھی طرح سمجھ لیں کہ اس سے مراد کیا ہے۔اس کے بعد وہ فیصلہ کریں کہ کیا اسلام کو نظامِ حیات بنانے کی ہم میں ہمت ہے۔اگر ہے تو پھر کسی قسم کی مخالفت کی پرواکئے بغیر' اس راستے پر گامزن ہو جائیے۔لیکن اگر وہ سمجھیں کہ اس قسم کے نظام کا قیام ان کے بس کی بات نہیں' تو وہ کھلے بندوں اس کا اقرار کر کے' دیگر اقوامِ عالم کی طرح اپنے ہاں سیکولر نظام رائج کر لیں۔اس سے وہ اگر مقامِ مومن تک نہیں پہنچ سکیں گے تو انہیں کم از کم مقامِ آدمیت تو نصیب ہو جائے گا۔لیکن انہیں' نہ اس نظام کے قیام کی ہمت ہوئی نہ اس اقرار کی جرأت۔نتیجہ اس کا وہ منافقت ہے جو اب قوم کے بیشتر حصہ کا شعار بن چکی ہے اور جس سے ہم جہنم کے ''اسفل'' میں پہنچ چکے ہیں۔

شباشب انقلاب لانے کے متمنی حضرات ذرا اتنا سوچیں کہ ہمارے پیش نظر تو قرآنی انقلاب ہے جو مظہر ہوتا ہے افرادِ قوم کے قلبی اور ذہنی انقلاب کا۔اگر ہم ان تحریکوں کی تاریخ پر بھی غور کریں جو معاشرہ کی کسی ایک شق میں تبدیلی پیدا کرنے کے لئے وجود میں آئی تھیں تو ہم دیکھیں گے کہ انہیں ابھی اپنے نظریات کی تبلیغ اور ان کے مطابق ذہنیتوں میں تبدیلی کے لئے سالہا سال (بلکہ بعض اوقات صدیوں تک) کا عرصہ لگ گیا اور اس کے بعد جا کر کہیں ذرا سی تبدیلی ہو سکی۔سطح بین نگاہیں ان تحریکوں کا مشاہدہ اس وقت کرتی ہیں جب وہ نظری انقلاب کی طول طویل مسافت طے کر چکنے کے بعد' ظہورِ نتائج کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہیں' اس لئے وہ سمجھتی ہیں کہ انقلاب شباشب آ جاتا ہے۔یہ ان کی نگاہ کی بھول ہوتی ہے۔انہیں کیا علم کہ قطرے کو گہر ہونے تک کس کس قسم کے ''حلقۂ صد کامِ نہنگ'' سے گزرنا پڑتا ہے۔

ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیا جانے
حالتیں کتنی گزر جاتی ہیں پروانے پر

ان تحریکوں کی نقالی کرنے والے بھی' اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور وہ تحریک کی صدیوں پر پھیلی ہوئی نہایت صبر آزما اور ہمت طلب لیکن خاموش و پرسکوت مسافت سے صرفِ نظر کر کے' آغازِ کار اس مرحلہ سے کر دیتے ہیں جہاں اس تحریک کی نمود محسوس پیکروں میں ہوئی تھی۔نتیجہ اس کا انقلاب نہیں فساد ہوتا ہے —— یعنی تخریب بلا تعمیر!

قرآن' مستقل اقدار کی رُو سے انقلاب کا پیامبر ہے اور فساد کو بدترین جرم قرار دیتا ہے اور اس قسم کے انقلاب کے لئے وہ دل اور دماغ دونوں کے انقلاب کو شرطِ لاینفک قرار دیتا ہے خواہ اس میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگ جائے۔

اور قرآن کے اسی انقلاب کا میں مبلغ ہوں اور اس کے لئے اُسی کے تجویز کردہ راستہ پر گامزن —— جو احباب مجھ سے کسی اور طریق کے متقاضی اور متمنی ہیں' میں ان کی خدمت میں اس سے زیادہ اور کیا عرض کر سکتا ہوں کہ

ز ما نگاہ طلب' کیمیا چہ می جوئی!

(مفہوم: تُو مُجھ سے دیکھنے والی نگاہ حاصل کر۔ کیمیا گری کے نسخے کیوں تلاش کرتا ہے۔ س۔ا)

بعض احباب کہتے ہیں کہ جس منزل کی تم نے نشاندہی کی ہے' وہ بھی درست ہے اور اس تک پہنچنے کا جو طریق تم تجویز کرتے ہو ہمیں اس سے بھی اتفاق ہے' لیکن تم نے اپنا مخاطب تعلیم یافتہ (INTELLECTUALS) عوام کا طبقہ قرار دے رکھا ہے حالانکہ موجودہ غلط معاشرہ میں سب سے بری حالت عوام کی ہے' اس لئے تمہیں چاہئے کہ عوام (MASSES) میں جا کر اپنے پیغام کی تبلیغ کرو۔ انقلاب عوام کے لانے سے آئے گا۔

میں اس وقت اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتا کہ قرآنی انقلاب عوام کے لانے سے آتا ہے یا اربابِ فکر و نظر کے قلب و دماغ میں تبدیلی پیدا کرنے سے۔ میں ان حضرات سے' جو سمجھتے ہیں کہ اصل کام کرنے کا میدان عوام کا طبقہ ہے' عرض کروں گا کہ جب بات آپ کے سامنے اس قدر واضح طور پر آ چکی ہے تو پھر آپ اُٹھ کر اس کے مطابق کام کیوں نہیں کرتے؟ آپ مجھ سے تقاضا کیوں کرتے ہیں کہ میں اپنا اختیار کردہ پروگرام ترک کر کے' اس پروگرام کو اختیار کروں جسے آپ بہتر قرار دیتے ہیں۔ ایک مامور من اللہ (رسول) کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی دوسرا کسی متبادل راستے کو اختیار نہیں کر سکتا لیکن میں تو نہ مامور من اللہ ہوں اور نہ ہی میں نے اس انقلاب آفرینی کا اجارہ لے رکھا ہے۔ میں نے بطیب خاطر' اپنے لئے زندگی کا ایک مشن تجویز کر رکھا ہے اور اسی پر میں گامزن ہوں۔ جو احباب میرے اس مشن کے ساتھ اتفاق کر کے میرے رفیق سفر بنتے ہیں' میں ان کی رفاقت کو شکریہ کے ساتھ قبول کرتا ہوں' جنہیں اس سے اختلاف ہوتا ہے' ان سے بصد معذرت عرض کر دیتا ہوں کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور اپنے لئے جونسا راستہ بہتر خیال کریں اسے اختیار کر لیں۔ اب آپ سوچئے کہ جو حضرات اس کے باوجود یہ اعتراض کئے جائیں کہ تم ہمارا تجویز کردہ راستہ کیوں اختیار نہیں کرتے' میں انہیں کیا جواب دوں۔ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات وہی لوگ کرتے ہیں جو خود کوئی تعمیری کام نہیں کر سکتے اور دوسروں کی تنقیص و تنکیر سے اپنے آپ کو اس خود فریبی میں مبتلا رکھتے ہیں کہ ہم بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ کام کرنے والا اگر کسی راستے کو غلط سمجھتا ہے تو اسے چھوڑ کر کسی دوسرے راستے پر گامزن ہو جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتا کہ خود ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور دوسروں کے پروگرام میں نقص نکال کر عمر بھر یہ شکایت کرتا رہے کہ وہ اس کے تجویز کردہ راستے کو کیوں اختیار نہیں کرتے۔

یہ ہے میرا مسلک' جس پر میں کاربند چلا آ رہا ہوں اور کاربند رہنا چاہتا ہوں کیونکہ میں اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق اسی کو صحیح سمجھتا ہوں۔

والسلام!

پرویز

خواجہ ازہر عباس، کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن پر اعتراضات کے جوابات

پناہ بلندی و پستی توئی   ھمہ نیستند آنچہ پستی توئی
شب زندگی کو سحر کرنے والے   ہر ایک دور کی روشنی تیرا نام
کب تک کروں میں ضبط آہ، اب   چل رے خامہ بسم اللہ، اب

چند سال پیشتر نیویارک، امریکہ سے ایک کتاب Leaving Islam کے نام سے طبع ہوئی تھی یہ کتاب جناب ابن وراق صاحب نے Edit کی ہے یہ ان کا فرضی نام ہے انہوں نے آج سے کافی عرصہ پیشتر ایک کتاب Why i am not a Muslim تصنیف کی تھی۔ موجودہ زیر نظر کتاب میں جناب ابن وراق صاحب نے ان لوگوں کے مضامین طبع کئے ہیں جو مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے تھے، پیدائشی طور پر مسلمان تھے لیکن ہوش سنبھالنے کے بعد اسلام چھوڑ دیا ہے۔ یہ تقریباً 25 حضرات ہیں جن کا تعلق پاکستان، ایران، بنگلہ دیش، ترکی، انڈونیشیا، مراکش اور بھارت سے ہے۔ اپنے ان مضامین میں انہوں نے اسلام ترک کرنے کی وجوہات تحریر کی ہیں۔ ان حضرات میں سے ایک صاحب وہ بھی ہیں جن کے ہم نیاز مند ہیں انہوں نے اپنی آخرت ''سنوارنے'' کے لئے اس ''کارخیر'' میں حصہ لیا ہے اور اپنا ایک مضمون اس ''قیمتی کتاب'' میں شامل کرایا ہے۔

یہ ہمارے عزیز محترم علمی دنیا میں بڑا مقام رکھتے ہیں۔ بالغ نظر ہیں، مغربی علوم کا گہرا مطالعہ کیا ہے، قرآن سے بھی واجبی اور سطحی سا تعلق ہے۔ عرصہ دراز سے مغرب میں ہیں۔ انہوں نے، ان کے بقول، قرآن کو عقل کے معیار پر جانچا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دور پہلا دور ہے جس میں مغرب اور امریکہ کے دانشور اس کو عقلی طور پر جانچ رہے ہیں ان حضرات کے لیے قرآن کا بھی یہ دعویٰ ہے کہ:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ط (41:54)

ترجمہ: ہم عنقریب ہی اپنی نشانیاں اطراف عالم میں اور خود ان کے نفوس میں دکھا دیں گیا۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ قرآن حق ہے یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ اس کا کیا ثبوت کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے ہے فرمایا اس کا یہ ثبوت ہے کہ

حقائقِ کائنات پر جو پردے پڑے ہیں علم انسانی جوں جوں اس پر سے پردہ اٹھائے گا اور جو حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آتی جائے گی وہ قرآن کریم کے کسی نہ کسی دعویٰ کا ثبوت ہوگی۔ اصل یہ کہ قرآن کا دور ہی اب آیا ہے اس کو علمی طور پر test کرنے کا دور اب شروع ہوا ہے ہر انقلاب اپنے دور سے پیشتر واقع ہوتا ہے۔ نزول قرآن کے وقت ہر طرف روح اور روحانیت کا دور دورہ تھا روح کا تصور مذہب میں ہوتا ہے اس کی پرورش اور اس کا تزکیہ پرستش سے ہوتا ہے پرستش کے نتائج مرنے کے بعد ملتے ہیں اس لئے اس دنیا میں اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا کہ کونسا مذہب درست ہے اور کہ کونسا مذہب درست نہیں ہے۔ جب کوئی قوم روحانیت کے گرداب میں پھنس جاتی ہے پھر وہ اس سے باہر نہیں نکل سکتی اور دنیا سے اسی قدر تنفر اس کا بڑھتا جاتا ہے مذہب اس دنیا کے مسائل حل کرنے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ مذہب کا اس وجہ سے بھی معلوم نہیں ہوسکتا کہ کونسا مذہب غلط یا صحیح ہے اس کے برخلاف قرآن کریم ذات انسانی، یا نفس انسانی کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس نفس انسانی کی پرورش کرنا انسان کا مقصد حیات بتاتا ہے۔ قرآن کریم ذات انسانی کو دین کی اساس قرار دیتا ہے اور اس کی پرورش اور اسکا تزکیہ کا طریقہ قرآنی نظام کی اطاعت قرار دیتا ہے۔ پرستش کے نتائج مرنے کے بعد آتے ہیں۔ اطاعت کے نتائج اس دنیا میں سامنے آتے ہیں قرآن کریم نے فرمایا: قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا ۚ طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ؕ (24:53) ان سے کہو قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں ایمان کے دعویٰ کی پہچان تو بڑی آسان ہے اور وہ پہچان یہ ہے کہ طاعۃ معروفہ، باتیں نہیں اطاعت یعنی ایسی اطاعت جو پہچانی جا سکے نظر آئے کہ اطاعت ہو رہی ہے۔ اطاعت کے نتائج سامنے آتے ہیں۔ قرآن نے روح، روحانیت اور پرستش کی تردید کی ہے۔ دنیا میں پہلی مرتبہ انسانیت کو ایک ایسے نظام سے متعارف کرایا جس میں سب سے زیادہ انسانیت کی تکریم ہے اس لئے اس نظام میں ایک انسان کی حکومت کو دوسرے انسانوں پر حرام قرار دیا گیا ہے جو انسان دوسرے انسان کی حکومت بخوشی اختیار کرتا ہے وہ ننگِ انسانیت ہے۔

من نہ دیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

یہ انسان خوئے غلامی میں کتے سے بدتر ہے کیونکہ میں نے نہیں دیکھا کہ ایک کتا دوسرے کتے کی اطاعت کرتا ہو۔ اس نظام میں اطاعت صرف قانون کی ہوتی ہے اس نظام میں اسکا صدر سب سے زیادہ قانون کا مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے اور دوسروں سے اس نظام کی اطاعت کراتا ہے چونکہ انسانوں کو قانون سازی کا اختیار نہیں اس لئے وہ اپنی اطاعت نہیں کرا سکتے (5:47،5:46،5:45) اس نظام کے جو نتائج دنیا میں آئے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

مسلمانوں سے غلطی یہ ہوئی کہ قرآنی نظام کے روشن اور درخشندہ نتائج آنے کے باوجود انھوں نے اس نظام کو ترک کر دیا۔ اور روحانیت کے عقیدہ کو اختیار کر لیا روحانیت کے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں وہ نتائج برآمد ہوئے۔ پوری قوم روحانیت تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے اولیاء اللہ کے مزارات، ہر جگہ پرستش ہی پرستش، نفلیں تہجد عمرے اعتکاف تبلیغی دورے زہرہ گداز، ریاضتیں الہام القاء کشف رویائے صادقہ، استخارے یہ سب قرآن کے خلاف سازشیں، خدا سے براہ راست علم حاصل کرنے کے طریقے تاکہ قرآن کی کوئی اہمیت باقی نہ رہے۔ یہ سب سوچی سمجھی سکیموں کے ماتحت ہوا۔ بنوعباس

نے چھ سو سال حکومت کی اور اسی دور میں ہمارا سارا لٹریچر تحریر کیا گیا۔ ہر خلیفہ کی ماں ایرانی تھی۔ آپ کمپیوٹر پر گوگل پر Majoosi Worship مجوسی ورشپ تحریر کر کے اس کو سرچ کریں صدقہ، درود وغیرہ اس میں آ جائیں گے یہ سب مجوسیوں کے ہاں سے ہمارے ہاں آیا ہے۔

حجۃ الاسلام والمسلمین محمد، بن محمد، بن محمد، الغزالی غیر عرب تھے ایرانی تھے طوسی کے رہنے والے تھے اب اس کا نام طوس کے بجائے مشہد ہے کیونکہ وہاں حضرت امام موسیٰ رضا علیہ السلام کا مزار ہے۔ شروع میں فلسفی تھے اور فلسفہ میں بڑا مقام رکھتے تھے مقاصد الفلاسفہ نام کی ایک کتاب تصنیف فرمائی جو فلسفہ میں ان کے بلند مقام کی تصدیق کرتی ہے یہ کتاب اب بھی ایم اے کی کلاسز میں تجویز کی گئی ہے ایک ہی مرتبہ اچانک روحانی ہو گئے جو کچھ نصف زندگی میں پڑھا پڑھایا اس سب کی تردید کر دی اور اس کے لئے ایک کتاب تہافتہ الفلاسفہ تحریر کی فلسفہ پر ایکس اعتراضات وار دکر کے فلسفہ کے پرخچے اڑا دئے امام غزالی نے جو کچھ ابتدائی نصف عمر میں پڑھا اس کی تبلیغ کی بعد میں نصف عمر اس کی تردید میں گزار دی۔ ساری عمر کا نتیجہ صفر۔ انہوں نے روحانیت کو بہت ہوا دی اور مسلمانوں اور اسلام کو سخت نقصان پہنچایا۔

نثر کی نسبت نظم کی زباں اپنی طرف کھینچتی (attract) ہے۔ وحدت الوجود، تصوف، روحانیت محی الدین ابن عربی اور امام غزالی کے تمام نظریات سے لیس ہو کر مولانا روم میدان میں اترے اور اپنی مثنوی تحریر کی یہ بہت مقبول ہوئی دنیا کا کوئی مسلمان ملک نہیں جہاں مثنوی کی پزیرائی نہ ہوئی ہو اسکو فارسی کا قرآن قرار دیا گیا۔

اور کتاب مثنوی شریف نے روحانیت کے عقیدے کو گھر گھر پہنچا دیا۔ ہم روحانیت اور نفس انسانی انکے مابین فرق انکے ثمرات نقصانات کے متعلق آگے ذکر کریں گے پہلے ہم عزیز محترم کے اعتراضات کو لیتے ہیں انکے جوابات کے بعد ہم اصل مضمون شروع کریں گے اور عرض کریں گے کہ قرآن نے انسانیت کو کیا دیا۔ جو روشنی کسی جگہ بھی آج نظر آ رہی ہے یہ سب قرآن کا صدقہ ہے۔

قرآن پر اعتراض کرنے والوں کی عام روش کے مطابق ہمارے محترم نے بھی قرآن میں عورتوں کے مقام اور انکے حقوق سے بات شروع کی ہے عورتوں کے حقوق اور مقام کے بارے میں انہوں نے ایک ہی مقام پر 230 صفحہ پر سات اعتراضات تحریر کئے ہیں ہم ان سب کا جواب ترتیب وار عرض کرتے ہیں پھر اصل مضمون شروع کریں گے۔ ہم ان کے اعتراضات علی الترتیب تحریر کرتے ہیں۔

1۔ تعداد ازواج۔

2۔ ازواج مطہرات، اور حضرت عائشہؓ کی عمر کا مسئلہ۔

3۔ عورتوں کے پردے کا مسئلہ۔

4۔ عورتوں کو کئی شادیوں کی اجازت کیوں نہیں۔

5۔ عورتوں کا مرتبہ مردوں سے کم کیوں ہے۔

6۔عورتوں کی وراثت نصف کیوں ہے اس سلسلے میں انہوں نے سورہ النساء کی 34ویں آیت دی ہے۔
7۔عورتوں کی شہادت کم کیوں ہے۔

یہ بات بھی خیال شریف میں رہے کہ نزول قرآن کے وقت تمام مذاہب اور معاشروں میں عورت کا کیا مقام تھا اور ان کے تقابل میں قرآن نے کیا مقام دیا نزول قرآن سے پیشتر اور نزول قرآن کے دوران بھی عیسائیت کا بہت بڑا اثر تھا۔عیسائیت کی رہبانیت میں عورتوں کا بڑا گھناؤنا تصور موجود تھا عقیدہ تھا کہ عورتیں ہی تمام جرائم ومکروہات کا سرچشمہ ہیں کیوں کہ عورت نے ہی آدم کو بہکا کے جنت سے نکلوایا تھا عورت کو ابلیس کا پیکر سمجھا جاتا تھا کیوں کے انکے خیال میں دنیا میں شران ہی کی وجہ سے باقی ہے عورت کو تمام برائیوں کا مجسمہ اور سخت قابل نفرت خیال کیا جاتا تھا۔عیسائیت کا ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ عورت کی روح نہیں ہوتی ایران میں عورتوں کے متعلق یہ تصور تھا۔

اگر نیک بودے سر احوالِ زن　　　زناں را مزن نام بودے نہ زن

زن کے معنی مارنا ہے یہ مصدر ہے زن کے معنی مار ہے شاعر کہتا ہے اگر عورت کی سرشت نیک ہوتی تو اسکا نام زن (مارو) نہ ہوتا بلکہ اس کا نام مزن (اسکو نہ مارو) ہوتا ایک اور شاعر نے کہا۔

چہ خوش گفت جمشید بارائے زن　　　کہ یا پردہ یا گور بہ جائے زن

شعر آسان ہے اس کا ترجمہ تحریر کرنے کی ضرورت نہیں۔عورتوں کی نفرت پر مشتمل بیشمار اشعار فارسی زبان میں ہیں عیسائیوں میں، اور ان کے اثر سے خود مسلمانوں کا یہ عقیدہ عام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور اس کی پسلی سے حوا کو نکالا جو اس کی بیوی تھی اس سے یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ آگے نسل کیسے بڑھائیں اور اسکے بہن بھائیوں کی شادی کیسے کریں اس کا مفسرین نے حل نکالا ہے لیکن جو بات غور کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حوا کو آدم کی پسلی سے کیوں نکالا۔کیا اس کے پاس مٹی کی کمی تھی۔حوا کا پتلا اور مٹی سے کیوں نہیں بنا دیا۔آدم کی نسل کو آگے بڑھانے کے لئے یہ طریقہ بہتر تھا کہ کچھ اور مٹی استعمال میں لائی جاتی۔جہاں تک قرآن میں عورتوں کے مقام کا ذکر ہے کہ قرآن نے فرمایا: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (17:70) ترجمہ: اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری دی یعنی آدمی کو حسن صورت، نطق، تدبیر وحواس عنائت فرمائے۔جن سے دنیوی اور اُخروی مفاد ومنافع کو سمجھتا ہے اور اچھے برے میں تفریق کرتا ہے۔ہر طرح کی ترقی کی راہیں اس پر کھولیں۔دوسری مخلوقات کو قابو میں لا کر اپنے کام نکالتا ہے خشکی میں طرح طرح کی گاڑیوں میں سفر کرتا ہے اور سمندروں میں کشتیوں اور جہازوں کے ذریعے بے تکلیف فاصلے طے کرتا ہے۔تکریم انسانیت کے اس بنیادی حق میں مومن، کافر، مرد، عورت کی کوئی تمیز وتفریق نہیں۔قرآن نے فرمایا خشکیوں اور پانیوں میں جتنی بھی فطرت کی قوتیں ہیں وہ اس کے تابع تسخیر ہیں اس تسخیر سے جس قدر خوشگوار سامان حیات ملے اس سے فائدہ اٹھانے میں مرد اور عورتیں سب شامل ہیں۔

قرآن کریم نے آدم (یعنی آدمی) کو نوع انسانی کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔قرآن کریم کی رو سے انسان

کی زندگی کی ابتداء ایک لائف سیل سے ہوئی۔قرآن نے اس کو "نفس واحدۃ" کہا ہے اس میں تذکیر و تانیث کا امتیاز نہیں تھا۔یہ جرثومہ ازخود دو حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔قرآن کریم فرماتا ہے: الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنۡہَا زَوۡجَہَا وَبَثَّ مِنۡہُمَا رِجَالًا کَثِیۡرًا وَّنِسَآءً ۚ (4:1) اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک جرثومہ حیات سے پیدا کیا پھر اس جرثومہ حیات سے اس کا جوڑا بنایا پھر ان جرثومہ حیات کے امتزاج سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد پھیلا دی ہے قرآن کریم کی رو سے عورتوں اور مردوں دونوں کا سرچشمہ حیات ایک نفس واحدہ ہی ہے۔

عربی زبان میں زوج ساتھی کو کہتے ہیں تانگے کے دو پہیہ ایک دوسرے کے زوج ہیں قینچی کے دو پھل ایک دوسرے کے زوج ہیں قرآن نے فرمایا: جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا وَّمِنَ الۡاَنۡعَامِ اَزۡوَاجًا ۚ (42:11)، (30:2) ترجمہ ہم نے مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنایا ہے۔دوسرے مقام پر ارشاد ہے: بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ (3:195) ترجمہ تم مرد اور عورت ایک دوسرے میں سے ہو اسلئے تم میں سے کوئی بھی اکیلا مکمل نہیں ہوتا۔فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعۡضَکُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ؕ (4:32) ترجمہ یعنی کچھ خصوصیات کے اعتبار سے مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے ایک خاندان یا معاشرہ میں زندگی بسر کررہے ہیں اگر ایک مرد زیادہ تعلیم یافتہ ہے معاشرے کے لئے زیادہ فائدہ مند ہے اسکو اس کے کنبے میں فضیلت حاصل ہوگی اگر اسکے برخلاف کسی کنبہ میں عورت زیادہ تعلیم یافتہ زیادہ باصلاحیت و باکردار ہے تو اسکو اپنے کنبہ کے لوگوں پر فضیلت ہوگی ایک دیگر مقام پر ارشاد ہے: وَجَعَلَ بَیۡنَکُمۡ مَّوَدَّۃً وَّرَحۡمَۃً ؕ (30:21) اللہ نے تم میں باہمی مؤدت اور رحمت بھی رکھی ہے وہ گھر جس میں شوہر اور بیوی کے درمیان بڑی ہم آہنگ زندگی گزر رہی ہے قرآن نے اس گھر کو جنت کہا ہے بیویوں کے لئے فرمایا: اَنۡ خَلَقَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡہَا (30:21) تمہارے لیے تمہاری قسم کے جوڑے بنائے تاکہ تم اپنی بیویوں سے سکون حاصل کرسکو اگر کسی شخص کو اپنے گھر میں اپنی بیوی سے سکون حاصل نہیں ہوتا تو اسکی شادی کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔قرآن نے عورتوں اور مردوں میں مشترکہ صلاحتیں گنوائی ہیں کوئی صلاحیت ایسی نہیں جو مردوں میں ہو اور عورتوں میں نہ ہو یہ آیت بہت طویل ہے لیکن ہم اسکو صرف اسلئے تحریر کررہے ہیں تاکہ آپکو یقین ہوجائے قرآن عورتوں میں وہ سب صلاحتیں تسلیم کرتا ہے جو مردوں میں ہیں ہم طوالت کی وجہ سے ترجمہ نہیں لکھ رہے آپ کسی نسخہ قرآن میں خود دیکھ لیں نیز یہ کہ آیت آسان ہے آپ خود بھی سمجھ سکتے ہیں ارشاد عالی ہے: اِنَّ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَالۡمُسۡلِمٰتِ وَالۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡقٰنِتِیۡنَ وَالۡقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیۡنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیۡنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالۡخٰشِعِیۡنَ وَالۡخٰشِعٰتِ وَالۡمُتَصَدِّقِیۡنَ وَالۡمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیۡنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالۡحٰفِظِیۡنَ فُرُوۡجَہُمۡ وَالۡحٰفِظٰتِ وَالذّٰکِرِیۡنَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا وَّالذّٰکِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰہُ لَہُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّاَجۡرًا عَظِیۡمًا ﴿۳۵﴾ (33:35) آپ غور کریں کہ قرآن کریم کس طرح مرد اور عورت کی صلاحیتوں کو پہلو بہ پہلو بیان کررہا ہے۔

عورتوں کے برابر کے مرتبہ اور درجہ کے متعلق قرآن میں ایک بڑی بلیغ آیت آئی ہے ہُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمۡ وَاَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّہُنَّ ؕ (2:187) ترجمہ وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان

کے لئے بمنزلہ لباس ہو میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ جس طرح کی وابستگی رکھتے ہیں یہ اس کی طرف اشارہ ہے اس اشارہ کو بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں میاں بیوی میں ایسا مضبوط رشتہ ہے اور ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ انکو کسی حالت میں بھی الگ الگ نہیں کیا جا سکتا میاں بیوی میں تعلق کے لئے لباس کا جو استعارہ قرآن نے استعمال کیا ہے ہم اسکی بلاغت کی طرف اشارہ کرتے ہیں لباس آدمی کی برہنگی کو چھپاتا ہے غالب نے کہا۔

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

لباس جسم کی برہنگی کو چھپاتا ہے میاں بیوی اپنے باہمی عیوب دوسروں سے چھپاتے ہیں اگر کوئی شخص عیب لگاتا بھی ہے تو یہ ایک دوسرے کا defence دفاع کرتے ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ شوہر کو گھر لینے اسکو خوب صورت کرنے، اور اپنا آپ سنوار کر رکھنے کی خواہش بیوی کیوجہ سے ہوتی ہے اسی طرح بیوی گھر کو خوب صورت اور Decorative اسی لئے رکھتی ہے کہ اسکا شوہر اس سے تسخیر ہو مرد یا عورت میں سے کوئی ایک بھی اپنے اس فطری محرک سے محروم ہو تو ایک مسافر کی طرح بن جاتا ہے اس کا کوئی مرکز نہیں رہتا اسی طرح جو عورت اپنے شوہر سے محروم ہو جاتی ہے اس کے سارے احساسات ختم ہو جاتے ہیں یہ مرد اور عورت کا باہمی تعلق ہے جسکی وجہ سے گھریلو رونقیں بہاریں انسانیت کو نصیب ہوتی ہیں اور اسی سے دنیا میں تہذیب و تمدن ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔

لباس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ لباس سردی گرمی کی سختیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ لباس انسان کو بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے چنانچہ ارشاد گرامی ہے: وَعَلَّمۡنٰهُ صَنۡعَةَ لَبُوۡسٍ لَّكُمۡ لِتُحۡصِنَكُمۡ مِّنۡۢ بَاۡسِكُمۡ‌ۚ (21:80) ترجمہ: اور ہم نے اس کو لباس کی صنعت سکھائی جو تمہیں حملہ سے محفوظ رکھتے ہیں اخلاقی پہلو سے یہی حال عورت کا مرد کے لئے ہے اور مرد عورت کے لئے شادی کے بعد دونوں میاں بیوی بد چلنی سے محفوظ ہو جاتے ہیں ان کی عصمت و عفت اور محفوظ ہو جاتی ہے۔

آپ غور فرما رہے ہیں جو مدارج ہم عورتوں کے تحریر کر رہے ہیں یہ کسی مذہب یا تمدن میں آپ کو نہیں ملیں گے سورہ بقرہ میں ارشاد ہے: وَلَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِىۡ عَلَيۡهِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ‌ (2:228) ترجمہ اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے مطابق۔ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ ہے (عدت کا) یعنی یہ بات تو حق ہے کہ جیسے کہ مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں ایسے ہی عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں جن کا قائدہ کے مطابق ادا کرنا ہر ایک پر ضروری ہے تو اب مرد کو عورت کے ساتھ بدسلوکی اور حق تلفی ممنوع ہو گئی البتہ مرد کو عورت پر ایک درجہ یہ ہے کہ عورتوں کو جو عدت کرنی پڑتی ہے وہ عدت مردوں کو نہیں کرنی ہوتی اس آیت میں فرمایا گیا کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق و فرائض بالکل ایک جیسے ہیں سوائے اس کے کہ مردوں کو عورتوں کی طرح عدت نہیں کرنی ہوتی۔ آپ مختلف تمدنوں اور تہذیبوں پر غور کریں ہر جگہ مردوں کے حقوق کا ذکر ہوتا ہے۔ عورتوں کے حقوق کا ذکر نہیں ہوتا۔ جہاں مردوں کے حقوق ہونگے اور عورتوں کی ذمہ داریاں ہونگی ہر جگہ علیھین نمایاں دکھائی دے گا قرآن نے کہا کہ حقوق و فرائض کے بارے میں مرد اور عورتیں بالکل ایک جیسے ہیں۔

ہم نے یہاں تک عورتوں کی اس عمومی حالت کا ذکر کیا ہے جو نزول قرآن کے وقت تھی اور اب بھی اکثر مقامات پر ہے

البتہ قرآن نے جو مقام عورتوں کو دیا ہے وہ کسی دوسرے مقام پر نہیں۔اب ہم عزیز محترم کے وہ اعتراضات جو عورتوں کے بارے میں انہوں نے کئے ترتیب وار لیتے ہیں۔

1۔تعددِ ازدواج:

سب سے پہلے انہوں نے تعدد ازدواج کے بارے میں اعتراض کیا ہے۔انکا اعتراض ایک حد تک اس لئے درست ہے کہ ہمارے معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ قرآن کے خلاف ہے۔

قرآن کے نزدیک اصول تو یہ ہے کہ عام حالات میں ایک میاں اور ایک بیوی ہو۔اصول تو ایک ہی بیوی کا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ (35:11) ترجمہ اور اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے پھر تم کو جوڑے جوڑے بنایا ظاہر ہے کہ جوڑا ایک مرد اور ایک عورت کا ہی ہوتا ہے دوسرے مقام پر ارشاد ہے:فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾(75:39) ترجمہ پھر کیا اس میں انسانوں میں جوڑا نر مادہ اس بارے میں ایک واضح آیت سورہ النساء میں آئی ہے فرمایا:وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ (4:20) ترجمہ اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو تو پہلی بیوی کا مہر پورا پورا ادا کر دو اور پھر اس کی جگہ دوسری بیوی لے آؤ اس آیت نے وضاحت فرمائی کہ ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی آئے گی زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ (4:20) بیوی کی جگہ بیوی۔اس پہلی بیوی کی موجودگی میں نہیں۔چونکہ قرآن کریم کے پیش نظر ہر ملک کے حالات ہیں اس لئے وہ ہنگامی حالات کے متعلق بھی ہدایات دیتا چلتا ہے اسی سورہ مبارکہ النساء کے بالکل شروع میں ارشاد فرمایا:وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (4:3) عربی زبان میں خود قرآن نے یتامیٰ کا معنی وہ بچے جن کے والدین فوت ہو جائیں کے علاوہ بیوہ عورتیں اور وہ عورتیں جن کے وارث نہ ہوں۔آگے چل کر قرآن نے یتامی النساء ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے (4:127) آیت کا مفاد یہ ہے کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن میں تمہیں اس بات کا خوف ہو کہ تم یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کے مسئلہ کو عام حالات کے مطابق حل نہیں کر سکتے تو اس کی یہ استثنائی صورت ہے کہ تم قانون میں عارضی طور پر Relaxation کرو اور ان میں سے ان عورتوں سے کہ جو تمہیں پسند کریں ان سے شادی کر لو ریاست خود اعلان کرے گی کہ قانون میں Relaxation دو بیویوں کی ہوگی ہے یا تین کی ہوگی اور اگر حالات بہت سنگین ہو گئے ہیں تو چار کی گئی ہیں بغیر ریاست کی اجازت کے دو شادیاں نہیں کر سکتے پھر دوسری شرط یہ لگائی کہ:فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (4:3) لیکن اگر تمہیں خوف ہے کہ اس Relaxation کے باوجود یتیموں اور بیواؤں میں انصاف جاری نہیں ہو رہا ہے پھر فواحدۃ تو پھر ایک ہی نکاح کرو۔اصولی طور پر قانون ایک ہی نکاح کا ہے ایک مرد ایک بیوی قرآن میں صرف یہی ایک مقام ہے جہاں تعددِ ازدواج کی اجازت ہے اس کے علاوہ ہر جگہ زوجین کا اصول بیان کیا گیا ہے ایک میاں اور ایک بیوی۔

The Human Self and Allah

Episode No. 14

By G. A. Parwez
(Translated by: Dr. Ejaz Rasool)

He Who created the numerous heavens one above another: no want of proportion will you witness in the creation of Ar-Rehman. So turn your vision again: see you any flaw? Again, turn your vision a second time: your vision will come back to you dull and discomfited, in a state of worn out. (67:3-4)

To the superficialglance no order and connection, no proportion and balance is visible in this system of the universe. But as human knowledge and experience keep expanding, his research takes him towards this absolute conclusion that there is no creasein theDivine creation, no wrinkle in the blanket oflunar light.

5.9 Increase or Decrease in Creation is According to Allah'sWill

Then, if this system of the universe had somehow come into existenceby chance, then whatever was made initially would have remained as such. Those who accept soul and matter to be from the past hold this very belief.They say that whatever number of souls have been created, there can be no decrease or increase in itnor can matter decrease or increase; only forms change now,alterations keep taking place in the moulds; or on the other hand, the doctrine of the materialists of Europe that,'what is life but the appearance of arrangements of elements, what is death but the disintegration of these elements'. According to them, the system of the universe is the name given to the various stages of the process of evolution, otherwise nothing here can increase or decrease.

But the universe created by Allah, the Wise and All-Knowing, is not of this type that after creating it He sat back (Allah forbid) as if He had become a useless limb. European philosophers think that the system of the universe is like a clock which once wound up, keeps running automatically. This doctrine is also a product of the human mind, it is not based on fact. To think that the Being which possesses thiscapabilitythat He can bring the universe into existence from nothing and formulate such laws according to which this functions with balance and synchronisation, that after doing so much, His powers became suspended and He sat back idle, is not knowledge but ignorance. The Possessor of such great powers - and idle! Does your intellect concede this? What, does evidence and observation also demonstrate this? Suspension

emerges at that time when allenergies end and life changes into death. The living One, and living with powers, and along with this established, He can never die. Leaving aside death, He cannot even doze off:

...No slumber can seize Him nor sleep...(2:255)

Therefore, the doctrine of suspension i.e. Allah sitting back idle, is a sign of shutting the eyes to facts. In the veins and arteries of the system of the universe, His Wisdom and Will is continuously functioning and working. He creates, then according to the law of*Mashe'at*, He has knowledge about the reality of what is not meant to remain any longerand He removes it, and that which has the ability to remain, He retains it:

Allah does blot out or confirm what He Wills: with Him is the mother of the Book (Divine laws). (13:39)

Having created, He has not now become oblivious of His creation:

And We have made, above you, many tracts; and We are never unmindful of creation. (23:17)

Not only beauty and adornments but keeps creating ever new creations:

...He adds to His creation as per His Will...(35:1)

Up till now there was mention of various aspects ofcreation. But the Quran has summed up all details and specifics into one sentence when it stated:

...the Creator of all things...(6:102) See also (39:62, 40:62)

This was the general aspect i.e. this proclamation that He is the Creator of everything. But to instill the truth in the mind in an unambiguous way, the Quran has made it clear by illustration with an example,that none other than Him has ever created anything:

Say: 'Have you seen partners of yours whom you call upon besides Allah? Show me what it is they have created in the earth. Or have they a share in the heavens?' (35:40) See also (46:4)

At one place this same question is asked in the form of a negative question:

O mankind! call to mind the grace of Allah unto you! Is there a Creator, other than Allah, to give you sustenance from heaven or earth? There is no Ilaah but He: how then

are you deluded away from the truth? (35:3)

5.10 False Gods are Themselves a Creation

Those whom you worship (whether they are human beings or signs of nature) are themselves creations of Allah:

Those whom they invoke besides Allah create nothing and themselves created. (16:20) See also (52:35-36)

These false gods are not only idols of clay and stones but are also living gods whose worship is carried out during their life or after their death. It is stated about their helplessness:

Yet they have taken, besides Him, gods that can create nothing but are themselves created; that have no control of hurt or good to themselves; nor can they control death nor life nor resurrection. (25:3)

At another place it is stated that if there had been another creator other than Allah, and if the creations of both had mingled together, then there could also be this doubt that there may be another creator. But when this is not the case, then how can one be deceived:

...or do they assign to Allah partners who have created (anything) as He has created, so that the creation seemed to them similar? Say: 'Allah is the Creator of all things: He is the one, Supreme and Irresistible.' (13:16)

Leaving aside some big thing, other than Allah no-one can createeven the smallestof things(22:73-74). When all these things which the erroneousvision of man converts into gods are created by Allah, then the Creator certainly knows what potentials there are in His Creation for various tasks. Hence, when He (the Creator) says that no-one possesses the capability to create anything in My creation, then this is a statement of the state of reality:

Should He not know – He that created? And He is the One that understands the finest details and is well acquainted with them. (67:14)

He is fully aware what potentials are hidden in His creation and where the limits of their potentials come to an end:

...for He is well-versed in every kind of creation. (36:79)

It should be made clear that wherever in these verses it is stated that nogod other than Allah has the power to create, by this is meant to bring into existence something from nothing. Otherwise, the other meaning of creationi.e. producing something by a new arrangement ofdifferent elements is that act of creationfor which man possesses the ability. When the Qurandeclares Allah asbeing the best of Creators (23:14, 37:125), there is a reference in this to the fact that there can be creators other than Allah. But He is the best ofCreators i.e. that ultimate beauty and adornment, complete balance and proportion which is found in the creation of Allahcannot be foundin the creation of others.

In the light of this discussion,reflect that when a *Jamaat* consists of those individuals whose selfsare becoming developed (i.e. the attributes of Allah are manifesting in their selfs), then the first trait of this *Jamaat* will be that it should become a partner in the creative programme of Allah. The fundamental trait of a *Momin*is creation, and creation also of such a type that,just as an attribute of Allahis that when He makes an intent about something then that thing becomes manifest and emerges, the state of a *Momin* should also be such that (within the constraintsof being human) when he intends to do something then this intent should assuredly reach its completion. In the same way that his Allah is not dependent on an outsiderfor the completion of His intents, similarly the state of the *Jamaat* of *Momineen* should be such that in the attainment of their aims they are not reliant on outsiders. This *Jamaat* will be the cause for the creation of ever new aims, lively objectives, and bright and sustainable wishesin the world.

When their Allah is not a static Being of inertia and an idol of stone but instead is aCreator and Maker, then does it suit them to spend a life that is static and suspended like stones? They should also be creators and makers (within the confines of being human). They should be the creator of their own world and in the creation of this new world, no-one should betheir equal or comparable– this is the very secret of being a *Momin*, this is the essence of his being, and this is the very proclamation of the Quran.

6 *Rabubiyat* (Sustenance)

After creation (*Takhleeq*), the first stage is *Rabubiyat*. This has already been explained that by *Kun-Fa-Yakoon* (Be! and it is) does not mean that by Allah saying '*Kun*' (Be), that thing at once comes into existence in its completed form. By this is meant that the process of its creation commences and by gradually going through evolutionary stages, it reaches its point of completion. Taking somethingfrom its point of initiation gradually towards its stage of completion and providing complete guidancefor this is called *Rabubiyat*, and the one Who does this is called *Rabb*. The general meaning of this will be the One who provides 'nourishment' i.e. *Rabubiyat* will mean that in order for something to be taken through all of its stages from its beginning until its completion; to oversee and supervise; provide nourishment; make it grow and enable it to reach its completion;

from a water drop till it becomes a pearl; till a seed becomes a tree; till water and clay turns to the form of a man; whatever kind of stages arise en routeto be watchful and to accommodate them, providing those means which are sufficient for its requirements and on which its life depends.

6.1 Displays of *Rabubiyat*

This arrangement that alongwith the birth of a child fountains of milk should gush forthfor its nourishment,was not a matter within the control of a human; this is a manifestation of the marvel of *Rabubiyat* of that Creator of the Universe. Then also reflect on these links in this process of *Rabubiyat*that, following the birth of a child and up to a period of two to two and a half years,how changes occur automatically in this diet of hisaccording to the demands of his nutrition. Because in the beginning the stomach of a child is fragile, therefore at the beginning the composition of the milk containsproportionately more water and less fat. As the child grows its stomach continues to develop the ability to digest a stronger diet and along with this ability, stage by stage, the proportion of water in the milk reduces and fat composition increases, although the milk producing 'machinery' is still the same and the constituents from which the milk is produced in the mother also remain unchanged, so much so that when the child develops the strength and ability to digest other food, then these springs of milk dry up. For those children who are placed on artificial feeding, charts are prepared for their diet which detailhow the proportion of water and milk will decrease and increase in relation to age. The principle of this proportion is defined on this process of nature which it keeps in view in relation to the child's diet. From this one systemit can be understood whether this arrangement is that of a 'blind nature' i.e. could the inventor of this process from which man,who possesses so much intelligence and understanding, knowledge and experience, obtains guidance to prepare food for the child, be a 'blind nature'? This is just an example, otherwise you will see that whichever thing you cast your eye on in thiswide and expansive system of the universe,whatever means of sustenance are needed are all present from the direction of nature from the beginning to the end at every stage for its survival and strength. For human lifeair,water, light and food are indispensable constituents. The state of air is such that wherever man is, whether travelling or not, low or high, day or night, ample air remains automatically around him and he is not even aware at what moment he takes a breath; so much so, that even during sleep this action continues to function automatically. This is the same situation with light.By reflectingon the system of 'water supply' which Allah's system of *Rabubiyat* has madefor water to reach every place, the intellect and vision become lost in amazement. The rays of the sun take clean and distilled waterfrom the brackish water of the oceansby evaporation to the heights of the atmosphereand leave contaminations behind. This freshwater floats around hither and thither in the vessels of the clouds,and wherever it is needed, the mouth of this vessel is opened.

8- مذہب کشمکش حیات سے فرار سکھاتا ہے۔

دین زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔

9- مذہب تقدیر کے بہانے انسان کو بے عمل بنا دیتا ہے۔

دین، اسے تقدیر شکن قوت عطا کر کے، حرکت و عمل کا شعلۂ جوالہ بنا دیتا ہے۔

10- مذہب خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات کا نام عبادت رکھ کر انسانوں کو خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے۔

دین، اسے وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل کا پیغام دیتا اور نظامِ خداوندی کو دنیا کے ہر نظامِ باطل پر غالب کرنے کو عبادت کی غایت بتاتا ہے۔

11- مذہب، کائنات کی ہر حسین شے پر منہ بسورنا اور نعمائے خداوندی سے اجتناب سکھاتا ہے۔

دین اعلان کرتا ہے کہ وہ کون ہے جو زیب و زینت کی ان چیزوں کو حرام قرار دے سکتا ہے، جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے (القرآن)۔

12- مذہب ہر جدت (نئی چیز) کو گناہ قرار دینے تک لے جاتا ہے۔

دین کہتا ہے کہ کل یوم ھو فی شان۔ زندگی کے تقاضے ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اس لئے جدت طرازی عین تقاضائے حیات ہے۔

13- مذہب اپنے پیغام کے حق کی دلیل میں اسے اسلاف کا مسلک قرار دے کر بطور سند پیش کرتا ہے۔ ان کی طرف سے پیش کردہ عقائد پر ایمان بلا علم و دلیل لانے پر زور دیا جاتا ہے۔

دین انسان کی علمی اور عقلی صلاحیتوں کو جلا دینے کا موجب اور اسلاف کے مسالک کی بلا دلیل پیروی سے منع کرتا ہے۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل اور برہان سے پیش کرتا ہے اور عقل و تدبر سے کام لینے کی تاکید بھی۔

14- مذہب کا تصور مفاد پرست انسانوں کے ذہن کا تراشیدہ ہے۔ ان میں سبھی ملوکیت (فرعون)، سرمایہ داری (قارون) اور مذہبی پیشوائیت (ہامان) کے نمائندے باہمی اشتراک سے دوسروں کی محنت سے کمائی پر عیش کی زندگی بسر کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز حیلے تراش کر مذہب میں شامل کر لیتے ہیں۔ خود مترفین بن کر دوسروں کو محکوم بنا لیتے ہیں۔

دین مذہب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کو آزادی کی دعوت دیتا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان کو اپنا محکوم اور اطاعت گذار بنائے۔ اطاعت صرف خدا (اس کے قوانین) کی کی جاسکتی ہے اور یہ قانون سب کے لئے برابر ہونے کی وجہ سے تمام نوعِ انسانی کے لئے مساوات کا پیغام رکھتا ہے۔

15- مذہب اس راستے کو کہتے ہیں جو انسانوں کا وضع کردہ ہو۔

دین اس قانون یا نظام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہو۔

اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے دین ہی کو پیش کیا ہے اور اسے ہی اسلام کا نام دیا ہے۔ لہٰذا مسلم مذہب کی نہیں دینِ اسلام کی اطاعت کرتا ہے۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.76
ISSUE
03

Monthly **TOLU-E-ISLAM**
25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com Web: www.toluislam.org
www.facebook.com/talueislam/ www.youtube.com/idaratolueislam